مولوی عبدالحق کے دکنی متون کا تحقیقی و تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

مقالہ نگار

انجم فاطمہ

(ایم۔اے، ایم فل)

09HUPH09

نگران

پروفیسر حبیب نثار

2020

شعبہ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

فہرست

پیش لفظ 3

1۔ سوانح حیات: مولوی عبدالحق 10

2۔ مولوی عبدالحق کی مرتبہ دکنی مثنویاں

(الف) مثنوی قطب مشتری 28

(ب) مثنوی گلشن عشق 58

(ج) مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں 88

3۔ مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی تذکرے

(الف) تذکرہ گل عجائب 141

(ب) چمنستانِ شعراء 173

4۔ مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی کی نثری تصانیف

(الف) معراج العاشقین 195

(ب) سب رس 222

حاصل مطالعہ 261

کتابیات 265

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ اور نبی کریم حضرت محمد صلی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکر سب سے پہلے ادا کرتی ہوں جس نے تحقیق کی اس کٹھن منزل کو طے کرنے میں کامیابی عطا فرمائی۔ اور جس کی وجہ سے میرا مقالہ ''مولوی عبدالحق کے دکنی متون کا تحقیقی وتقابلی مطالعہ'' پایہ تکمیل تک پہونچا۔

ایم۔فل کے بعد Ph.D میں داخلہ لینے کے بعد میری خواہش تھی کہ ایم۔فل کی طرح Ph.D میں بھی مخطوطے کو ہی اپنا موضوع منتخب کروں۔ ایک دن میں (انجم) نے اپنی خواہش کا اظہار استاد محترم ڈاکٹر حبیب نثار صاحب سے کیا تو انہوں نے دھیمی سے آواز میں کہا۔ بیٹا اتنے آسان موضوع پر کام کرنا چاہتی ہو۔'' مجھے تو پتہ نہیں استاد محترم نے اس طرح سے کیوں کہا۔ ترتیب متن پر کام کرنا 'جوئے شیر' لانے کے برابر ہے۔ پھر یہ میرے آسان کس طرح ہوگیا...... جوں توں کرتے کرتے موضوع کے انتخاب کا دن آ گیا۔ میں نے پھر سے میرے نگران استاد محترم سے کہا: صاحب موضوع۔ تو انھوں نے مجھے ایک موضوع دیا...... ''مولوی عبدالحق کے دکنی متون کا تحقیقی وتقابلی مطالعہ'' ...... اِس موضوع کو یاد کرنے مجھے پورا ایک گھنٹہ لگ گیا...... میں (انجم) سوچتی رہی اللہ یہ کیا موضوع ہے۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد ابھی گھبراتے ہوئے ''مسند نشین'' سنبھال ہی رہی تھی کہ کمیٹی کے ایک ممبر نے مجھ سے پوچھا...... آپ کس موضوع پر کام کرنا چاہتی ہیں...... میں نے آہستہ سے اپنا موضوع بتایا۔ کمیٹی کے ممبروں میں سے کسی نے کہا...... بیٹا جس موضوع کا انتخاب کیا ہے تمہیں سمجھ میں آیا...... میں خاموش بیٹھی رہی...... پھر کسی نے کہا: اس موضوع میں مولوی عبدالحق کی غلطیوں کو بتانا ہوگا۔ کسی نے کہا، اس موضوع کے لئے اچھے حافظے کی ضرورت ہے۔ میں چپ چاپ تمام ممبروں کی باتوں کو سنتے بیٹھی رہی۔ پھر میرے نگران استاد محترم نے تمام کمیٹی ممبروں سے کہا...... ''بچی اسی موضوع پر کام کرے گی...... مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے''۔ اللہ اللہ کرتے میں کمرے سے باہر آ گئی۔ موضوع کے انتخاب کے بعد پہلے موضوع کو

سمجھنا اور دوسرا اُس پر لکھنا پہاڑ چڑھ کر گرنے کے برابر تھا...... میں ہمیشہ استاد محترم سے کہتی......صاحب مجھے موضوع سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ وہ ہر دوسرے دن مجھے ایک نئی کتاب کا نام لکھواتے اور اُسے پوری پڑھنے کو کہتے۔ ایسے ہی کئی کتابوں کا مطالعہ کرتے کرتے دو سال گزر گئے۔ نہ تو مجھے یہ موضوع سمجھ میں آیا۔ اور نہ ہی اُس پر لکھنا۔ اور میں استاد محترم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ صاحب میں اس موضوع پر کام کرنا نہیں چاہتی، کیونکہ استاد محترم سے کہنا کہ اس موضوع پر کام نہیں کرنا چاہتی، گستاخی کرنے کے برابر ہے۔ میں کبھی اُن سے گستاخی کرنا سوچ بھی نہیں سکتی۔ موضوع میرے لئے کتنا بھی مشکل کیوں نہ ہو۔ میں Ph.D مقالہ اسی موضوع پر داخل کروں گی...... یہ سوچ کر میں چپ ہوگئی۔

میں (انجم) نے موضوع ''مولوی عبدالحق کے دکنی متون کا تحقیقی وتقابلی مطالعہ'' کو اپنی سہولت کے لئے چار حسب ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول:۔ مولوی عبدالحق کی سوانح اور علمی وادبی خدمات

دکنیات کے فروغ میں مولوی عبدالحق کا حصہ

باب دوم:۔ عبدالحق کی مرتبہ مثنویوں کا تحقیقی وتقابلی مطالعہ

(الف) قطب مشتری

(ب) گلشن عشق

(ج) جنگ نامہ عالم علی خاں

باب سوم:۔ عبدالحق کے مرتبہ دکنی تذکروں کا مطالعہ

(الف) چمنستان الشعراء

(ب) گل عجائب

باب چہارم:۔ عبدالحق کی مرتبہ دکنی نثری تصانیت کا تحقیقی وتقابلی مطالعہ

(الف) سب رس

(ب) معراج العاشقین

حاصل مطالعہ:۔ مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی متون کا مطالعہ۔

به یک نظر (اختتامیہ)

کتابیات

باب اول میں مولوی عبدالحق کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ علمی وادبی خدمات کا بیان کیا گیا ہے۔اسی میں میں مولوی عبدالحق کی اُن تمام نگارشات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو دکنی ادب سے تعلق رکھتے ہیں اور دکنی کتابوں کے علاوہ دکنی مضامین کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں مولوی عبدالحق کے مرتبہ مثنویوں کے متون کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں قطب مشتری، گلشن عشق اور جنگ نامہ عالم علی خان شامل ہیں۔مثنوی قطب مشتری کا ایک نسخہ ایشیا ٹک لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔اُس کا عکس حاصل کرتے ہوئے مولوی عبدالحق کے مرتبہ متن کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔تقابلی مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے لندن کا نسخہ دیکھا ہی نہیں اور یونہی اپنی مرتبہ تصنیف میں جھوٹ لکھا ہے۔

گلشن عشق کو مولوی عبدالحق نے چار قدیم نسخوں کی مدد سے 1952ء میں مدون کیا ہے۔لیکن انہوں نے کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں مخزون ایک قدیم نسخہ نہیں دیکھا جس کے تقابل سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی عبدالحق کا مرتب کیا ہوا متن اکثر مقامات پر ناقص رہ گیا ہے۔

مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں کو مولوی عبدالحق نے 1932ء میں مرتب کیا۔اس مثنوی کے خالق غضنفر نے مثنوی میں جو مضامین لکھے ہیں اور جو مواد پیش کیا ہے اُس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غضنفر خود میدان جنگ میں عالم علی خان کے ہمراہ موجود تھا۔اُس کی ساری ہمدردی عالم علی خاں کے ساتھ معلوم ہوتی ہے۔لیکن اُس نے نواب قمرالدین علی خاں نظام الملک کی بھی تعریف کی ہے۔

مولوی عبدالحق نے اس مثنوی کو مرتب کرتے ہوئے جملہ تین قلمی نسخوں کو سامنے رکھا ہے۔قابل مرتب نے دکن کی اس قابل ذکر جنگ کا انتہائی مختصر ذکر کیا ہے۔اس مثنوی کا ایک اہم کردار عالم علی خاں کی ماں کا ہے جس نے اپنے بیٹے عالم علی خاں کو جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔بعدازاں ہمیں نواب مرزا شوق کی مثنوی ''زہر عشق''میں ماں کا ایسا ہی کردار ملتا ہے۔ان تمام کوتاہیوں کی نشاندہی کرنے کی راقمہ الحروف نے کوشش کی ہے۔اوراس طرح تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

تیسرے باب میں مولوی عبدالحق کے مرتبہ دو دکنی تذکروں چمنستان الشعراء اور گل عجائب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چمنستان الشعراء کو مولوی عبدالحق نے 1929ء میں ایک نسخے کی مدد سے مرتب کر کے شائع کیا...... دوسرا تذکرہ اسد علی خاں تمنا کا گل عجائب ہے جسے مولوی عبدالحق نے مرتب و شائع کیا ہے۔

اسی باب میں مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی متون کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں مولوی عبدالحق کی دکنی خدمات کو سراہتے ہوئے اُن کی تحقیق کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی کتابیات بھی درج کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں عبدالحق کی مرتبہ دکنی نثری تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں سب رس اور معراج العاشقین شامل ہیں۔ سب رس کو مولوی عبدالحق نے چار نسخوں کی مدد سے 1932ء میں مرتب کر کے شائع کیا اور مقدمے میں صرف دو نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے ایک بمقام دولت آباد 1187ھ کا، دوسرا 1177ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق کا کہنا ہیکہ وجہی نے کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ یہ قصہ اُسے کہاں سے ملا۔ مگر وجہی کی سب رس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وجہی نے جس قصہ کو بیان کیا ہے، اُس کا ذکر اُس نے متن میں کیا ہے۔ راقمہ الحروف نے ان تمام خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دوسری نثری تصنیف معراج العاشقین ہے جس کو مولوی عبدالحق نے دو نسخوں کی مدد سے 1924ء میں مرتب کیا۔ معراج العاشقین کو عبدالحق نے حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا ہے۔ مگر راقمہ الحروف نے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تصنیف ''معراج العاشقین کا مصنف'' کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تصنیف حضرت خواجہ بندہ نواز کی نہیں بلکہ حضرت سید مخدوم شاہ بلکانوی (جو میراں جی خدانما کے مرید اور خلفیہ گزرے ہیں) کی ہے۔

تحقیق میں موضوع کے انتخاب کے بعد سب سے پہلی اور اہم منزل مواد کی فراہمی ہوتی ہے جس کے لئے مختلف ذرائع سے رجوع ہونا پڑتا ہے۔ بزرگوں، اساتذہ اور مختلف کتب خانوں سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں سے اپنا مواد اکٹھا کیا ہے۔ ان میں کتاب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو، شیخ داؤد سنٹر فار اورینٹل ریسرچ، کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی اور اندرا گاندھی میموریل لائبریری حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی شامل ہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے فرزند رفیع الدین قادری نے تحقیق کے مراحل میں میری مدد کی۔ اور رہنمائی فرمائی۔ جس کے لئے میں شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اسی ادارے سے وابستہ دوسرے اصحاب حفیظ الدین صاحب، شکور صاحب، شاہین نے بھی مدد کی۔ میں اُن سب کی شکرگزار ہوں۔

کتب خانہ آصفیہ لائبریری سے تنویر میڈم اور وہاں کے دوسرے اسٹاف کی تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے مجھے ہر وقت مخطوطات کو دیکھنے اور مخطوطات کی (C.D) حاصل کرنے میں مدد کی۔

اس مقالے کی تیاری میں میرے ساتھی ڈاکٹر ایم معین الدین، ڈاکٹر امتیاز فاطمہ، ڈاکٹر اسماء مبین، بشریٰ چشتی، اور ہندی شعبہ سے تعلق رکھنے والی میری ساتھی قیصر سلطانہ نے مقالے کی تیاری میں ہر لمحہ میری مدد فرمائی۔

شعبہ اُردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے تمام اساتذہ ڈاکٹر میر محبوب حسین، ڈاکٹر عرشیہ جبین، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر زاہد الحق کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے تحقیق کے دوران مفید مشوروں سے نوازا۔

پروفیسر بیگ احساس اُس وقت صدر شعبہ اردو تھے جب میرا داخلہ عمل میں آیا تھا اور پروفیسر صاحب ہی نے میرے تجویز کئے ہوئے موضوع کو میری تحقیق کے لئے منظور کیا تھا۔ میں استادِ محترم کی ممنون ہوں۔

استاد محترم ڈاکٹر حبیب نثار کے بارے میں کیا لکھوں۔ اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کچھ لکھنے بیٹھتی ہوں تو میرا قلم خود بخود رک جاتا ہے کیونکہ میں اُن کا شکریہ ادا کرنے کو اپنے آپ کے قابل نہیں سمجھتی۔ اگر دنیا کی تمام زبانوں میں موجود شکریہ کے الفاظ یکجا کئے جائیں تب بھی شاید استاد محترم کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ وہ اس لئے کہ میرے لئے اس موضوع کو پایہ تکمیل تک پہونچانے میں صرف اور صرف اُن کا ہاتھ ہے۔ میں ہر بار استاد محترم سے یہی کہتی۔ صاحب مجھے موضوع سمجھ میں نہیں آ رہا ہے...... وہ مجھ سے یہی کہتے۔ ''بیٹا میں ہوں'' بس انہی الفاظ پر میں اپنے کو سمجھنے لگی۔ انہوں نے جس محنت، شفقت اور محبت سے میری رہبری و رہنمائی فرمائی کہ اس ناممکن موضوع کو میں ممکن کر دکھانے کا حوصلہ جٹا پائی۔ سچ تو یہ ہے کہ استاد محترم کی رہنمائی نے میری اس تحقیق کے مشکل سفر کو بہت آسان بنا دیا...... ان ہی کی حوصلہ افزائی اور مفید مشوروں کی وجہ سے میں نے مولوی عبدالحق جیسے محقق کی تحقیق پر لکھنے کی ہمت کی۔ اور اُنہی کے بتائے ہوئے نقش قدم پر چل کر میں تحقیق کے میدان

میں اپنا پہلا قدم رکھا ہے اور میں ہمیشہ اُنہی کے بتائے ہوئے نقش قدم پر چلتی رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے استاد محترم کو علم کا ایک سمندر عطا کیا ہے کہ وہ اس سمندر سے ایک ایک قطرہ اپنے طالب علموں پر لٹاتے رہتے ہیں۔ بس آخر میں یہی کہنا چاہتی کہ اللہ تعالیٰ استاد محترم کو ایسا ہی رکھے تاکہ وہ آنے والے اسکالرز کا مستقبل ہم سے زیادہ روشن کر سکیں۔ ایک بار پھر دنیا کے تمام زبانوں میں موجود شکریہ کے الفاظ یکجا کر کے ڈاکٹر حبیب نثار صاحب کا شکریہ غالب کے اس مصرع کے ساتھ ادا کرتی ہوں۔

حق تو یہ ہے کہ، حق ادا نہ ہوا

آخر میں اپنے دادا جان محمد وکیل احمد مرحوم (ایڈوکیٹ) اور دادی جان کی بے حد ممنون و مشکور ہوں جن کی ہمت افزائی اور دعاؤں کی بدولت مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ''شرف'' حاصل ہوا۔ اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ انھیں عمر دراز و صحت عطا فرمائے۔

میں اپنے عزیز والدین محمد ریاض احمد صاحب اور والدہ قدسیہ بیگم صاحبہ کی تاحیات احسان مند رہوں گی۔ تب بھی اُن کے کسی احسان کا بدلہ نہیں دے سکتی۔ انھوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں ہر وقت ہمت افزائی کی اور میرا خیال رکھا۔ میں اپنے والدین کے لئے اللہ کے دربار میں دست بدعا ہوں کہ اللہ انھیں صحت و تندرستی عطا فرمائے اور تاحیات ان کا شفیق سایہ میرے سر پر برقرار رہے۔ (آمین)

اس کے بعد میرے بڑے بھائی تنویر احمد اور میری بھابھی ساجدہ بیگم کا اگر شکریہ ادا نہ کروں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے ناخوش ہوگا۔ والدین کے بعد سب سے زیادہ اس مقالے کو داخل کرنے میں میرے بڑے بھائی اور بھابھی کا ہاتھ ہے۔ میرے بڑے بھائی نے میری شادی سے پہلے اور شادی کے بعد سب سے زیادہ ساتھ دیا ہے۔ جب بھی کوئی مشکل آئی تو میں نے مُڑ کو پیچھے دیکھا تو سب سے پہلا چہرہ مجھے میرے بڑے بھائی کا نظر آیا۔ جب بھی میں لکھنے بیٹھتی بنا کچھ بولے میری بھابھی چائے، کافی میرے روم تک لے آتیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ترقی کے ساتھ ساتھ صحت و تندرستی عطا فرمائے اور تاحیات ان کا شفیق سایہ میرے سر پر برقرار رہے (آمین)۔ میری بڑی بہن کنیز فاطمہ، میرے جی جو (Jijo) شیخ نثار احمد اور میرے چھوٹے بھائی تفسیر احمد کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے میرے اس تعلیمی سفر میں ہر وقت میرا ساتھ دیا اور ان تمام کے حق میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں ترقی عطا فرمائے اور ان کے مستقبل کو روشن کریں۔ ان کے نیک ارادوں اور

مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔(آمین)

آخر میں اپنے خسر محمد شبیر پٹیل صاحب، ساس غوثیہ بیگم صاحبہ اور خاوند محمد مزمل پٹیل کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے شادی کے بعد اس تحقیقی سفر کو جاری رکھنے میں ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔اللہ تعالیٰ ان کو صحت وتندرستی عطا فرمائے۔اورتاحیات اُن کا سایہ میرے سر پر برقرار رہے۔(آمین)

انجم فاطمہ

(ایم۔اے)گلبرگہ

(ایم۔فل)حیدرآباد

کمرہ نمبر110،ویمنس ہاسٹل نمبر3

ایچ سی یو کیمپس،حیدرآباد

باب اوّل

سوانح حیات: مولوی عبدالحق

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے اپنے ایک مقصد کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کردی ہو۔ مولوی عبدالحق اُنھیں لوگوں میں سے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کی ساری دلچسپیوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے صرف اور صرف اُردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی پیدائش 20 اگست 1870ء کو اتر پردیش کے ضلع میرٹھ کے ایک قصبے ہاپوڑ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہی حاصل کی۔ 1888ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ میں داخلہ لیا اور 1894ء میں یہیں سے فلسفہ و تاریخ سے بی۔اے کیا۔ قیام علی گڑھ کے دوران سر سید احمد خاں اور اُن کے رفقاء کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ مختار الدین احمد اپنی کتاب ''ہندوستانی ادب کے معمار'' میں لکھتے ہیں:

> ''اگر یہ کہا جائے کہ عبدالحق، مولوی عبدالحق اور بابائے اُردو علی گڑھ کے طفیل بنے تو اس میں ذرّہ برابر مبالغہ نہ ہوگا۔ عبدالحق پر کیا موقوف ہے، اس زمانے کے بیشتر عہد ساز ہستیوں نے محمڈن کالج علی گڑھ اور اس کے بانی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی۔ حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، وحیدالدین سلیم جو اُردو ادب کی دنیا میں آفتاب و ماہتاب بن کے چمکے، ان میں سے ہر ایک نے اسی ادارے اور اس کے رہنما سے کسبِ نور کیا تھا۔ عبدالحق کو ان بزرگوں اور ان کے علاوہ کئی دوسرے اہم لوگوں کی صحبتوں سے فیض اُٹھانے کا موقع ملا۔ سر سید کے بیٹے سید محمود ان پر خاص طور پر مہربان تھے۔ خود سر سید کی شفقتیں بھی ان کے حال پر کم نہ تھیں''۔(۱)

اختتام تعلیم پر وہ ملازمت کی تلاش میں بمبئی پہنچے۔ بمبئی سے سر سید کے دوست رفیق نواب محسن الملک (Finance Secretary of Hyd) نے انھیں اپنا پرائیوٹ سکریٹری مقرر کیا۔ اس کے بعد 1895ء میں نواب محسن الملک کا تعارفی خط لے کر مولوی عزیز مرزا (Home Secretary of Hyd) کے پاس آ گئے اور عزیز مرزا نے آپ کو بحیثیت مترجم اپنے دفتر میں ملازم رکھ لیا۔ اس کے بعد افسر الملک جو نواب نصیر جنگ (جو میر محبوب علی خاں نظام ششم کے ریڈی کانگ اور فوج آصفیہ کے سپہ سالار تھے) نے اپنے اسکول

''مدرسہ آصفیہ'' میں 1900ء میں صدر مدرس مقرر کیا۔ صدر مدرس ہونے کے بعد ''رسالہ افسر'' جس کو افسر الملک نے جاری کیا اوران ہی کی فرمائش پر مولوی عبدالحق نے 1900ء سے اس کی ادارت کی ذمہ داری قبول کی۔ مختارالدین احمد ''رسالہ افسر'' پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افسر 32 صفحات پر مشتمل ایک فوجی رسالہ تھا۔ اس میں پریڈ اور دیگر فوجی اُمور سے متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ گویا اس کا دائرہ کار بہت محدود تھا۔ مولوی صاحب نے اس کے صفحات کی تعداد بڑھا کر 48 کردی۔ آٹھ صفحوں پر مشتمل ایک حصہ فوجی اُمور سے متعلق رکھا اور باقی صفحات علمی، تاریخی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین کے لئے واقف کردیئے۔(۲)

مولوی عبدالحق نے اس رسالے میں ایک جدت یہ کی کہ 1900ء ہی کے شمارے میں یہ اعلان کردیا کہ ہر ماہ سب سے اچھے مضمون پر ایک اشرفی بطور انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ اس کے تحت سب سے پہلا انعام سید بے نظیر شاہ وارثیؒ کوان کی نظم ''حکمت ظاہری و باطنی'' پر دیا گیا اور یہ رسالہ 1902ء میں بند ہو گیا۔

مولوی عبدالحق چندسال تک ''مدرسہ آصفیہ'' میں صدر مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد 1911ء سے 1915ء صدر مہتمم تعلیمات بنا کر اورنگ آباد بھیج دیئے گئے۔ اورنگ آباد کا قیام مولوی صاحب کو بہت راس آیا۔ اسی دور میں انھوں نے بہت سے علمی وادبی کارنامے انجام دیئے اور بابائے اُردو کا خطاب بھی انھیں اسی دور کی دین ہے۔

مولوی عبدالحق کے بابائے اُردو کے خطاب پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مسرت فردوس، محمد احمد سبزواری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''مولوی صاحب کا خطاب بابائے اُردو بھی انھیں اورنگ آباد کالج کے ہاسٹل سے ہی ملا تھا۔ ایک مرتبہ طلبہ نے مولوی صاحب کو ہاسٹل میں کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد مولوی صاحب نے ودیا مند اسکیم ہندی، ہندوستان کے متعلق اظہار خیال کیا۔ طلبہ جوش میں

آ گئے۔ایک نوجوان محمد یوسف نے نعرہ لگایا اور زندہ باد، بابائے اردو زندہ باد......بس پھر کیا تھا ساری محفل بابائے اُردو زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔ جب اس واقعہ کی خبر اورنگ آباد کے ایک مقامی ہفتہ وار میں شائع ہوئی تو سرخی تھی ''بابائے اُردو کا کالج کے طلبہ سے خطاب'' پھر یہ خطاب حیدر آباد پہنچا اور وہاں سے اُردو کے ساتھ ساتھ سارے برصغیر میں پھیل گیا اور جب تک اُردو زندہ ہے، بابائے اُردو کا نام زندہ رہے گا''۔(۳)

انجمن ترقی اُردو مولوی عبدالحق کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔انجمن ترقی اُردو1903ء میں وجود میں آ گئی جس کی تفصیل کو ڈاکٹر مسرت فردوس بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''یہ انجمن 4 جنوری 1903ء کو سالانہ جلسہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں قائم ہوئی۔ انجمن کے قیام کے وقت ہی قواعد وضوابط مرتب ہوگئے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مطابق انجمن کے عہدیدار حسب ذیل تھے:

صدر انجمن...... پروفیسر ٹامس آرنلڈ گورنمنٹ کالج لاہور

نائب صدر......شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد

نائب صدر......شمس العلماء مولوی محمد ذکاءاللہ

نائب صدر......مولانا خواجہ الطاف حسین حالی۔

سکریٹری......شمس العلماء مولوی محمد شبلی نعمانی

اسسٹنٹ سکریٹری......مولانا حامد علی سہارن پوری(۴)

انجمن کے پہلے سکریٹری مولانا شبلی نعمانی 1903ء تا 1905ء تک تھے۔اس کے بعد 14 ڈسمبر 1905ء تا 1910ء کو حبیب الرحمٰن خاں شیروانی انجمن کے دوسرے سکریٹری مقرر ہوگئے۔1910ء میں عزیز مرزا انجمن کے تیسرے سکریٹری بنے مگر 24 فروری 1912ء کو عزیز مرزا کا انتقال ہوگیا۔انتقال کے بعد عزیز مرزا

کے فرزند سجاد مرزا بیگ کو چند دنوں کے لئے انجمن کا سکریٹری بنایا گیا۔مگر ایجوکیشنل کانفرنس کے منعقدہ اجلاس 30 ڈسمبر 1912ء بمقام لکھنؤ میں مولوی عبدالحق انجمن ترقی اُردو کے پانچویں سکریٹری بنائے گئے۔

مولوی عبدالحق جس وقت انجمن کے سکریٹری بنائے گئے، وہ اُن دنوں اورنگ آباد میں صدر مہتمم کے عہدہ پر فائز تھے۔ چونکہ مولوی صاحب کو یہ دونوں ذمہ داریاں ساتھ ساتھ نبھانا کچھ مشکل ثابت ہوا اس لئے 1912ء کو انجمن ترقی اُردو کا دفتر اورنگ آباد منتقل ہوگیا اور ادھر 1917ء کو حیدرآباد میں دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو مولوی عبدالحق دارالترجمہ کے ناظم کی حیثیت سے اورنگ آباد سے حیدرآباد واپس آگئے۔ اور دو سال یعنی 1917ء سے 1919ء تک حیدرآباد میں قیام کیا۔ اس کے بعد دوبارہ اورنگ آباد منتقل ہوگئے۔ 1922-23ء میں عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج کی اورنگ آباد کی بنیاد رکھی گئی اور مولوی عبدالحق کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اسی کالج سے 1929ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوگئے۔ اسی دوران مولوی وحیدالدین سلیم کے (جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اُردو) انتقال کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد اور سر اکبر حیدری کے اصرار پر 1930ء میں جامعہ عثمانیہ شعبہ اُردو کی صدارت مولوی عبدالحق نے قبول فرمائی اور 1938ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ 1913ء سے 1938ء تک کا دور مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اُردو کا سنہری دور کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اورنگ آباد کے دور میں انجمن نے کئی کتابیں شائع کیں اور دو رسالہ ''اُردو'' اور ''سائنس'' جاری کئے۔ جگہ جگہ انجمن کی شاخیں قائم کی گئی اور کئی کتب خانے۔ اسی دوران نومبر 1938ء میں انجمن ترقی اُردو کا دفتر اور مولوی عبدالحق کا ذاتی ساز و سامان کے ساتھ دہلی منتقل ہوگئے۔ ڈاکٹر مسرت فردوس حمید ہاشمی فرید آبادی نے انجمن کی پنچاہ سالہ تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''انجمن جس وقت علی گڑھ سے اورنگ آباد آئی تو کل کائنات ایک ٹوٹا ہوا صندوق تھا۔ اور جب یہاں سے دہلی چلی تو مطبوعات کے ذخائر مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لادے گئے۔ چھاپے خانے کا کثیر بھاری سامان اور کلوں کو حمل و نقل کی دشواری کی وجہ سے اورنگ آباد میں فروخت کردینا پڑا۔ مولوی صاحب کا بیش بہا ذاتی کتب خانہ اور لغت، اُردو کا دفتر جو حیدرآباد سے براہ راست دہلی گیا، بجائے خود ایک ڈبہ الگ تھا''۔(۵)

انجمن کا دفتر دلی منتقل ہونے کے بعد مولوی عبدالحق انجمن کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ ابھی انجمن کا کام پوری طرح دلی میں جم بھی نہ سکا کہ ملک کی سیاست کا رُخ بدل گیا اور شدت سے اُردو کے مخالفت پیدا ہوئی۔ حالات روز بہ روز ناسازگار ہونے لگے۔ ملک کی تقسیم کا اعلان ہوگیا۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی، فسادات پھوٹ پڑے۔ دلی میں انجمن کا دفتر تباہ کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے انجمن کی کئی قیمتی کتابیں، فائلیں، مسودے اور کئی کاغذات ہمیشہ کیلئے پاکستان چلے گئے۔ پاکستان پہنچ کر مولوی عبدالحق نے کراچی میں ''اردو کالج'' کی بنیاد رکھی۔ 1948ء میں رسالہ ''قومی زبان'' جاری کیا۔ پھر سے انجمن ترقی اردو کی از سرِ نو تنظیم کی، اُردو یونیورسٹی کی مہم کا آغاز کیا، اور اپنے تصنیفی و تالیفی کاموں میں اس طرح مصروف ہوگئے جیسے پاکستان میں نہیں بلکہ حیدرآباد دکن یا دلی میں ہوں۔ اس طرح مولوی عبدالحق کی پوری زندگی صرف اور صرف اُردو کی خدمت کرنے میں گزر گئی اور آخر کار 16 اگسٹ 1961ء کو کراچی میں وفات پائی۔

مولوی عبدالحق اُردو ادب کے صفِ اول کے نقاد، ادیب، محقق، مترجم، ماہر دکنیات، تبصرہ نگار، خاکہ نگار، لغت نویس، ماہر صرف و نحو اور ایک صحافی بھی تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔ ابتداء میں انھوں نے علی گڑھ کے قیام کے دوران ''رسالہ تہذیب اخلاق'' میں مضامین لکھ کر اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ مولوی عبدالحق نے ایسے ادبی ماحول میں پرورش پائی جس میں زندگی کا جوش اور ولولہ تھا، بابائے اردو کو ابتداء سے آخر تک پُر وقار اور گرانمایہ شخصیتوں کی صحبت اور رفاقت نصیب ہوئی۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران سرسید، سید محمود، شبلی، حالی، محسن الملک، وقارالملک اور آرنلڈ وغیرہ، اس کے بعد حیدرآباد میں افسرالملک، عزیز مرزا، مہاراجہ کشن پرشاد، نواب عمادالملک، سر اکبر حیدری، پنڈت سندر لال، ڈاکٹر تارا چند، پنڈت کیفی، سر کیلاش، سر بال کشن کول، پنڈت بنارسی داس، شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، وحیدالدین سلیم، سید علی بلگرامی، سر تیج بہادر وغیرہ کی معاونت سر پرستی حاصل رہی۔

مولوی عبدالحق کا ایک بڑا کام اُردوئے قدیم کے پوشیدہ خزانوں کی دریافت اور ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہے۔ دکنی اُردو کی کئی داستانیں، مثنویاں، تذکرے، دواوین، حیدرآباد اور بیجاپور کے شاعر خاندانوں کی ادبی خدمات، غرض ایسے ہی کئی موضوعات کا تعارف اور ان کی تحقیقی و تنقیدی نظر سے ہماری تہذیبی تاریخ کا حصہ بن گئے۔ ان میں خاص طور پر کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، قطب مشتری، گلشن عشق، سب رس، معراج

العاشقین، جنگ نامہ عالم علی خاں، رانی کیتکی کی کہانی، باغ و بہار، مثنوی خواب وخیال، دریائے لطافت، کلام میر، ذکر میر، دیوان اثر، تذکروں میں گل عجائب، چمنستان الشعراء، نکات الشعراء، مخزن نکات، تذکرہ ریختہ گویاں، تذکرہ ہندی، ریاض الصفحاء، عقد ثریا اور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولوی عبدالحق محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نقاد بھی تھے۔تنقید پر ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ملتی۔ لیکن ان کے تنقیدی خیالات کا اندازہ ان کے مضامین، تبصرہ اور مقدمات سے ہوتا ہے۔ ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تنقید میں چند اُصولوں کو اپنے پیش نظر ضرور رکھتے تھے اور ان کی تنقید انھیں اُصولوں کی روشنی میں پروان چڑھی۔تنقید ادب کی نشوونما کے لئے بہت ضروری ہوتی ہے اور نقاد ادب میں وہی کام کرتا ہے جو ایک مالی اپنے باغ کے لئے تنقید پر رائے دیتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ زندگی بسر کرنا اور اسے صحیح طور سے برتنا ہی خود ایک بڑی نیکی ہے اور یہ تعلیم ادب کی اصل غرض وغایت ہے، جس کی تکمیل تنقید کی بدولت ہوسکتی ہے۔تنقید کئی خدمتیں انجام دیتی ہے۔ خود نقاد اور ادیب کے حق میں بھی یہ اصلاح کا باعث ہے۔ اسے ذاتی اظہار کی قدر کا موقع دیتی ہے اور ضبط سکھاتی ہے۔ایک طرف وہ سنت قدیم پر غیر ضروری شیفتگی سے بچاتی ہے اور دوسری طرف جدت یا جذبات کے زور میں تمام حدود کو توڑ کر نکل جانے سے روکتی ہے یعنی بریک کا کام دیتی ہے''۔(۶)

اور آگے نقاد پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک نقاد کے لئے جو اس کٹھن اور صبر آزما کام میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ وسیع مطالعہ، گہری نظر اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔تنقید وہی لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت وہی دے سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دوربین ہو، جو صرف ذوقِ صحیح نہ رکھتا ہو۔ بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو، جس نے ایک مدت کے مطالعہ اور غور وفکر کے

بعد اِن اُمور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہواور وہ اس رائے کو بیان
کرنے کی قدرت رکھتا ہواور دوسروں کے دل نشین کرسکتا ہو"۔(۷)

مولوی عبدالحق مشرقی اور مغربی تنقید کے نقدِ اصول سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ اپنے تنقیدی مضامین، مقدمات، تبصروں اور خطبات میں ان دونوں سے کام لیا ہے اور انھیں بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا نظریہ تنقید بہت وسیع، ہمہ گیر اور رنگارنگ تصورات کا مرکب ہے۔ وہ تنقید میں کسی ایک اُصول کے پابند نہیں۔ ان کے پاس تاثراتی تنقید، سائنٹفک تنقید اور تقابلی تنقید کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ وہ حآلی کے بتائے ہوئے تنقیدی اُصولوں کے کافی قریب دکھائی دیتے ہیں لیکن حآلی کی طرح اُن کے نزدیک تنقید حرف آخر نہیں ہوتی۔ تنقیدی شعور کی پختگی، احساس کی شدت اور ادبی ذوق کو عبدالحق نے تنقید کے لئے قابل قدر بنایا ہے۔ چنانچہ وہ کسی بھی ادبی پہلو پر قلم اُٹھاتے ہیں تو بغیر سوچے سمجھے کسی بھی تنقیدی خیالات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ نہایت غور وفکر کے بعد لکھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے کوئی پہلو بھی اوجھل نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے ان کی تنقید نگاری میں جزیات نگاری کی شان پائی جاتی ہے۔

مولوی عبدالحق کسی بھی موضوع پر تنقید کرتے ہیں تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ دلائل اور روایت سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردیتے ہیں۔ موضوع کتنا بھی معمولی اور غیر اہم کیوں نہ ہو اس کو اتنا سراہتے ہیں کہ معائب آپ ہی آپ دل پسند ہوجاتے ہیں۔ وہ دکھتی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ حقائق اور سچی بات کو بے دھڑک کہہ دیتے ہیں، وہ اپنے دور کے رجحانات پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"مولوی نذیر احمد جیسے عالم نے جتنے ناول لکھے وہ سب اس وقت کی زندگی اور معاشرت کا آئینہ ہیں۔ لیکن اس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرر اور آزاد کی روح نئے جون میں نمودار ہوئی ہے۔ ہمارے ادیب اور شاعر عالم خیال میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور روز بروز حقیقت اور زندگی سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے گویا وہ زندگی کی حقیقتوں اور دشواریوں اور ان پر غور وفکر سے بچنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن کیا وہ ان حیلوں سے بچ سکیں گے؟ ادب کی بنیاد زندگی

پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر سی کہانی ہے''۔(۸)

مولوی عبدالحق نے اپنے تحقیقی کارناموں پر جو مقدمے لکھے ہیں ان میں اعلیٰ درجے کی تنقید موجود ہے۔ ان کے مضامین اور تبصرہ نگاری میں بھی تنقید کے اہم پہلو نظر آتے ہیں۔ان کے بے شمار مضامین اور تبصرے موجود ہیں۔مولوی عبدالحق کے مضامین اور تبصرہ نگاری کا آغاز زمانہ طالب علمی میں ہوا۔ان کا پہلا تبصرہ ''ریویو ہدیہ ناظر'' کے عنوان سے یکم اگست 1893ء کے علی گڑھ گزٹ (ص۹) سے شائع ہوا۔اس کے بعد جنوری 1921ء میں جب رسالہ 'اُردو' اورنگ آباد سے منظر عام پر آیا تو مولوی عبدالحق نے تبصرہ نگاری کا خاص اہتمام کیا۔مولوی عبدالحق نے کئی موضوعات پر تبصرے کئے جن میں نفسیات،طب،فلسفہ،تاریخ ادب،قواعد،مزاج، شاعری اور ناول وغیرہ شامل ہیں۔ان تبصروں سے مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی بصیرت اور تبصرہ نگاری سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔1939ء میں ''چند تنقیدات عبدالحق'' کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جس میں 10 تبصرے شامل ہیں۔اس تصنیف میں 1921ء سے 1933ء تک کے تبصروں کو یکجا کیا گیا ہے۔اس کے بعد محمد تراب علی خاں باز نے 1921ء سے 1942ء تک کے تمام تبصروں کا انتخاب کرکے ''تنقیدات عبدالحق'' کے نام سے شائع کیا اور اس مجموعے میں تقریباً 23 تبصرے شامل ہیں۔تبصروں کے علاوہ ان کے مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کے کئی مضامین ''رسالہ اردو'' میں ہی شائع ہوئے ہیں۔مولوی عبدالحق کے مضامین کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے کئی مضامین دکنی ادب پر لکھے جس سے تحقیق کے لئے راستے ہموار ہوئے۔دکنی ادب کے خاص مضامین کے موضوعات میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی، حضرت خواجہ بندہ نواز، حضرت میراں جی شمس العشاق، حضرت برہان الدین جانم، حضرت امین الدین علی اعلیٰ ولی دکنی اور دکنی ادب کے علاوہ باغ و بہار، غالب، سرسید احمد خاں، حالی، شبلی، سرسید راس مسعود۔اس کے علاوہ پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں کئی خطبات، اصطلاحات، زبان و قواعد کے متعلق کئی مضامین لکھتے ہیں۔ان مضامین اور تبصروں کی زبان اور اسلوب کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ان پر سرسید احمد خاں اور حالی کا اثر ہے۔یہ کچھ حد تک درست بھی ہے اور غلط بھی۔کیوں کہ سرسید کی نثر کی طرح مولوی عبدالحق کی نثر بھی سادہ ہے لیکن سرسید احمد خاں کے اسلوب میں ایک نمایاں فرق بھی ہے۔سرسید کی زبان و بیان میں کسی بھی طرح کی احتیاط نہیں برتتے اور اُن کی زبان میں انگریزی کے الفاظ کا استعمال بہت ملتا ہے۔جب کہ مولوی عبدالحق کی زبان

خوشگوار اور پُر اثر ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق کی زبان بول چال سے قریب ہوتی ہے لیکن اس میں ایک خوشگوار شگفتگی ہوتی ہے جو قاری کو دھیرے دھیرے اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔ نثار احمد فاروقی مولوی عبدالحق کی زبان پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی (عبدالحق) تحریر میں حالؔی کی حلاوت اور سادگی، متانت اور وقار، شبلی کی رنگینی اور بذلہ سنجی، مہدی کی لطافت و نظامت، نذیر احمد کی محاورہ بندی، رشید احمد صدیقی کی رعایت لفظی اور صوتیاتی اُفق کا لحاظ، عبدالماجد دریا آبادی کے طنز اور فرحت اللہ بیگ کے مزاج کا نہایت دل نشین کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو ایسا لب و لہجہ دیا جو سب اصنافِ نثر کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ صحیح، صاف، سادہ، دلنشین اور سنجیدہ نثر لکھنے کی جو روش عبدالحق نے ایجاد کی ہے اسے اُردو کی معیاری نثر کہا جا سکتا ہے''۔(۹)

زبان کی یہی سادگی، شگفتگی اور دل نشینی ان کی خاکہ نگاری اور مرقع نگاری میں بھی پائی جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' ایک اہم تصنیف ہے۔ ''چند ہم عصر'' اٹھارہ خاکوں پر مشتمل ہے جو 1900ء سے 1937ء کے درمیان لکھے گئے۔ یہ سب خاکے ایسی شخصیتوں پر ہیں جن کو مولوی عبدالحق خوب اچھی طرح جانتے اور اُن سے واقف تھے۔ ان میں سر سید، حالی، مولانا محمد علی جوہر، امیر مینائی، محسن الملک اور وحیدالدین سلیم جیسے اہم قلمکاروں کے علاوہ نام دیو مالی اور نور خاں جیسے غریب اور گمنام لوگ بھی شامل ہیں۔ نور خاں کا خاکہ ''گدڑی کا لال''، ''نور خاں'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ خاکہ کچھ اس طرح سے شروع ہوتا ہے۔

''لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں، نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں۔ اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے۔ بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں

کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق رموز ہوسکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے''۔(۱۰)

اپنے دوسرے خاکہ نام دیو، مالی کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہوگیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں''۔(۱۱)

اور آگے لکھتے ہیں:

''ایک دن نامعلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر نہ ہوئی کہ کیا ہورہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ خضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا، اتنا کاٹا کہ بے دم ہوگیا۔ آخری اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اُسے شہادت نصیب ہوئی''۔(۱۲)

مولوی عبدالحق کے خاکوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے خاکوں کو پڑھنے سے قاری کے ذہن میں اس کی تصویر صاف طور پر بن جاتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہؔر کی شخصیت کو چند الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیئر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و آزادی کا دلدادہ اور جبر واستبداد کا پکا دشمن تھا لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔

وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولہ ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جان نثار اور فدائی تھے۔ لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے''۔(۳۱)

''چند ہم عصر'' کا آخری خاکہ مولانا الطاف حسین حاؔلی کا ہے۔ مولوی عبدالحق حاؔلی کو اپنا آئیڈیل مانتے تھے اور ان کی ادبی خوبیوں اور علمی قابلیت سے بے حد متاثر بھی تھے۔ مولوی عبدالحق کے تمام خاکوں میں حاؔلی کا خاکہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ حاؔلی کی جو تصویر مولوی عبدالحق نے پیش کی ہے ایسا لگتا ہے حاؔلی کی تمام اوصاف کو ایک کوزے میں بند کر دیا ہے۔ مولانا حاؔلی کے اوصاف کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے انھیں بہت رنج و افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا تج اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو۔ بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو بُرا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہے''۔(۱۴)

مولوی عبدالحق کے تمام خاکوں میں مولانا حالی کا خاکہ سب سے طویل ہے۔ اس کی ایک وجہ حالی سے ذاتی قربت اور ذاتی پسند بھی تھی۔ کیوں کہ علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور اُن کے علمی و ادبی خیالات سے فیض یاب ہونے کا موقع بھی حاصل ہوا۔

مولوی عبدالحق اُردو کے ایک اہم خاکہ نگار، تبصرہ نگار، تنقید نگار کے ساتھ ایک محقق بھی ہیں اور تحقیق میں ان کا اُصول میدان مقدمہ نگاری ہے۔ مقدمہ نگاری تحقیق کا ایک اہم حصہ ہے۔ مقدمہ نگاری میں مرتب کو تین اہم منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے کتاب کے مصنف کے حالاتِ زندگی کا بھرپور جائزہ لئے۔ اس

کے بعد وہ کتاب کے موضوع سے روشناس کراتے ہوئے ادب میں اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالے تاکہ قاری اگر کتاب کے اصل موضوع سے واقف نہ ہو تو مقدمہ کے مطالعہ سے واقف ہو جائیں اور اُس سے استفادہ کر سکیں۔ مقدمہ کی آخری منزل میں وہ کتاب کے سارے پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اُس دور کے زبان کی لسانی خصوصیات پر روشنی ڈالتے۔ یہی مرتب کا فرض ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق بیسویں صدی کی اُن عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو ادب کی خدمت میں اپنی ساری زندگی گزار دی۔ اُنھوں نے سیرت نگاری کی، انشائیے بھی لکھے، لسانیاتی بحثیں بھی چھیڑیں، تراجم بھی کئے، لغت اور قواعد نگاری کے رمز سے بھی آشنا کئے، قدیم ادب کا سراغ لگایا، پرانے شعراء کے دیوان اور تذکرے مرتب کئے، نثر کی قدیم سے قدیم کتابوں کو تلاش کر کے ان کا متن ترتیب دیئے اور ان پر مقدمے لکھے۔

مولوی عبدالحق کے بعض مقدمے ایسے موضوعات پر ہیں جو ان کا میدان نہیں لیکن ان پر بڑے ہی عالمانہ اور مفکرانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن میں اسلام اور سائنس کے مختلف مسائل ہیں۔ ان مقدمات میں ''مقدمہ مبادیٔ سائنس'' مقدمہ معرکہ مذہب و سائنس، مقدمہ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام اور مقدمہ الجہاد' وغیرہ شامل ہیں۔ ان مقدمات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے دینی اور دنیاوی پہلوؤں کے متعلق مولوی عبدالحق کے خیالات ونظریات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان مقدمات میں سب سے اہم وہ مقدمے ہیں جو خود ان کی مرتب کی ہوئی کتابوں پر لکھے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں زیادہ قدیم اُردو کے کلاسیکی ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ان کتابوں پر مقدمے لکھ کر نہ صرف اُن کا تعارف کروایا۔ بلکہ تحقیقی اور تنقیدی دونوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ ان کی تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسی لچک پیدا کی کہ وہ ہر زمانے میں زندہ رہ سکتی ہے۔ حالانکہ تحقیق میں کوئی کام حرف آخر نہیں ہوتا بلکہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہتی ہے اور وہ تحقیق کو خشک اور بوجھل ہونے نہیں دیتے بلکہ کچھ ایسی سادگی سے اُس کی وضاحت کرتے ہیں کہ ان کی تحقیق قاری کے لیے حد درجہ دلچسپ بن جاتی ہے اور ساتھ ہی تمام ضروری معلومات اُسے حاصل ہو جاتے ہیں اور موضوع کے تمام نشیب وفراز اُس پر روشن ہو جاتے ہیں۔

غرض مولوی عبدالحق کے ادبی سرمائے کا سب سے اہم اور قابل قدر حصہ ان کے مقدمات ہیں۔ انھوں

نے مختلف اور متنوع موضوعات سے متعلق تصانیف پر مقدمے لکھے ہیں۔ان کے موضوعات ادبی،تہذیبی اور معاشرتی بھی ہیں۔ان مقدمات میں انھوں نے فلسفہ وسائنس کے اسرار ورموز بھی کھلتے ہیں اورادب وشعر کے نکتے بھی بیان کئے ہیں۔دین اور مذہب کے حقائق کے چہرے سے پردے بھی اُٹھائے ہیں۔معاشرت اور تہذیب کی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں اور تاریخی اور سیاسی حقیقتوں کو آئینہ بھی دکھایا ہے۔خود ان کے ادبی کاموں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں جو مدد ان مقدمات سے ملتی ہے۔وہ ان کی کسی اور تحریروں سے نہیں ملتی۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اُردو ادب کے ان شعراء اور مصنفوں کو زندگی عطا کی جو معنوی طور پر مر چکے تھے۔اس طرح وہ اردو ادب کے مسیحا جو کئی مردوں کو زندہ کیا اور ان کو ایک نئی زندگی بخشی۔اُردو کے فروغ اور کوششوں میں سب سے زیادہ اہم اور افادی کوشش قدیم دکنی مخطوطات کی دریافت،ترتیب اور اشاعت ہے۔حکیم شمس اللہ قادری،ڈاکٹر محی الدین قادری زور،نصیر الدین ہاشمی،پروفیسر عبدالقادر سروری اور عبدالحق اردو کے وہ مایہ ناز محقق ہیں جنھوں نے اردو ادب کی تاریخ کو وسعت بخشی۔آج خواجہ بندہ نواز گیسودراز،شیخ عین الدین گنج العلم،سید محمد عبداللہ حسینی،سلطان محمد قلی قطب،ملا وجہی،ملا غواصی،شاہ میراجی شمس العشاق،ملک خوشنود رستمی،نصرتی،ولی اورنگ آبادی کے نام اردو کے طالب علموں سے پوشیدہ نہیں۔دکن میں ان قدیم اُردو مخطوطات کا سرغ لگا کر مولوی عبدالحق نے اُردو کے ماضی میں ایک دو صدی کا اضافہ کردیا۔

یوں تو مولوی عبدالحق کے تحقیقی کاموں کی فہرست بہت طویل ہے مگر دکنی ادب کے فروغ میں ان کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔1922ء سے لے کر 1940ء تک مولوی عبدالحق نے دکنیات پر کئی تصانیف اور مضامین شائع کئے جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

ا۔اُردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام

مولوی عبدالحق کی یہ کتاب 1933ء میں انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) سے شائع ہوئی۔یہ کتاب صرف 84 صفحات پر مشتمل ہے۔مولوی عبدالحق کی یہ ایک اہم تحقیقی تصنیف ہے۔اس تصنیف کے مطالعے سے اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔تو دوسری طرف بزرگان دین کے حالات اور ان کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی معاشرت کی اہم جھلکیاں بھی واضح ہوتی ہیں۔

۲۔سب رس

یہ وجہی کی نثری تصنیف ہے۔اس کو مولوی عبدالحق نے 1932ء میں انجمن ترقی اُردو سے اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔اس تصنیف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قطب شاہی دور کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کے وجہی کے حالات زندگی کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔سب رس دراصل ایک تمثیلی داستان ہے اور اس داستان کا ماخذ بھی یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی مثنوی ''دستور عشاق'' کا ترجمہ حسن و دل ہے۔

۳۔معراج العاشقین

یہ ایک تصوف کے موضوع پر نثری رسالہ ہے جس کو مولوی عبدالحق نے 1924ء میں اپنے مختصر مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ یہ رسالہ صرف 30 صفحات پر مشتمل ہے اور مولوی عبدالحق نے اس کو دو ہی نسخے سے مرتب کیا۔معراج العاشقین کے مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ رسالہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز ہے۔مگر 1967ء کی تحقیق کے بعد ڈاکٹر حفیظ قتیل نے پانچ عناصر اور پچیس گن سے یہ ثابت کیا کہ یہ رسالہ حضرت خواجہ بندہ نواز کا نہیں بلکہ بعد کے ایک صوفی شاعر مخدوم شاہ حسینی کا ہے۔

قطب مشتری

قطب مشتری از وجہی ایک عشقیہ مثنوی ہے۔وجہی نے یہ مثنوی 1018ھ یعنی محمد قلی قطب شاہ کے دور میں لکھی۔اور مولوی عبدالحق نے اس مثنوی کو 1938ء میں انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) سے شائع کیا۔اس مثنوی کو مولوی عبدالحق نے دو نسخوں سے ترتیب دیا ہے۔

گلشن عشق:

نصرتی کی ایک عشقیہ مثنوی ہے۔اس مثنوی میں منوہر ومہ مالتی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔

نصرتی

نصرتی کے حالاتِ زندگی مولوی عبدالحق کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔اس تصنیف کو مولوی عبدالحق نے 1952ء میں کراچی سے شائع کیا۔اس میں نصرتی کی شاعری کی جملہ اصناف،مثنوی،قصائد،رباعی،غزل، مرثیوں کا جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی عادل شاہی دور کے واقعات کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

چمنستان الشعراء

لچھمی نارائن شفیق کا تذکرہ چمنستان الشعراء کو مولوی عبدالحق نے 1928ء میں مرتب کیا۔اس تذکرے کو مولوی عبدالحق نے ایک نسخہ ہی سے مرتب کیا ہے۔یہ ایک واحد نسخہ ہے۔

گل عجائب

اسد علی خاں تمنا ایک اہم تذکرہ ہے اور اس تذکرے کو مولوی عبدالحق اپنے مختصر مقدمہ کے ساتھ 1936ء میں انجمن ترقی اُردو سے شائع کیا۔یہ تذکرہ 58 شعراء پر مشتمل ہے۔اس تذکرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شمال اور جنوب دونوں شاعروں کو شامل کیا ہے اور اسے حرف تہجی سے ترتیب دیا گیا ہے۔

مولوی عبدالحق کو تحقیق میں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے کلیات محمد قلی قطب شاہ کو متعارف کروایا اور اس کلیات کے متن کو موضوع بنا کر انہوں نے 1921ء میں ایک طویل مضمون انجمن کے رسالے ''اردو'' کی پہلی اشاعت میں شائع کیا۔دکنیاتِ مولوی عبدالحق میں دکنی سے متعلق مولوی عبدالحق کا یہ پہلا مضمون ہے۔مولوی عبدالحق کے دکنی مضامین کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

فہرست مضامین ''رسالہ اُردو''

-1	حیدرآباد کا ایک خاندان	جولائی 1922ء
-2	سب رس (وجہی) اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب	اکٹوبر 1924ء
-3	وصال العاشقین ۔از سید شاہ حسین ذوق	جولائی 1925ء
-4	گلشن حسن و دل از۔	جولائی 1925ء
-5	حضرت میراں شمس العشاق	اپریل 1927ء
-6	حضرت شاہ برہان الدین جانم	جولائی 1927ء
-7	جنگ نامہ سید عالم علی خاں	جنوری 1932ء
-8	گلشن عشق	جنوری 1933ء
-9	علی نامہ	اپریل 1934ء
-10	شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء بیجاپور تاریخ اسکندری	جولائی 1934ء
-11	نصرتی قصائد و غزلیات اور کلام پر رائے	اکٹوبر 1934ء
-12	بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان شاہ امین الدین علی اعلیٰ	جنوری 1928ء

حوالے

-1 ہندوستانی ادب کے معمار عبدالحق از مختار الدین احمد صفحہ 14 1984ء

-2 ایضاً ص 24

-3 (بحوالہ) بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی خدمات قیام اورنگ آباد کے دوران ۔از ڈاکٹر مسرت فردوس ۔ص 360 جنوری 1999ء

-4 بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی خدمات قیام اورنگ آباد کے دوران ۔از ڈاکٹر مسرت فردوس ص 125

5- ایضاً ص231

6- ہندوستانی ادب کے معمار عبدالحق۔از مختار الدین احمد ص84 1984ء

7- ایضاً ص85

8- سہ ماہی ''اُردو'' جنوری تا مارچ1986ء صفحہ 36 مضمون: بابائے اُردو کے لسانی تنقیدی اور تہذیبی تصورات۔از: ڈاکٹر حنیف فوق

9- (بحوالہ) محیص و تجربہ۔از۔ پروفیسر یوسف تقی ص101 2001ء

10- چند ہم عصر۔مولوی عبدالحق ص90، 1986ء

11- ایضاً۔خاکہ نام دیو مالی

12- ایضاً

13- چند ہم عصر۔مولوی عبدالحق ص106۔خاکہ الطاف حسین حالی 1986ء

14- ایضاً

باب دوّم

مولوی عبدالحق کی مرتبہ دکنی مثنویاں

(الف)''مثنوی قطب مشتری''

وجہی گولکنڈہ کا ایک عظیم شاعر اور نثر نگار گذرا ہے۔ 1960ء سے اب تک جو تحقیق ہوئی ہے۔ اُس کا حاصل یہ ہے کہ وجہی ابراہیم قطب شاہ کے آخری عہد میں یعنی 973ء تا 974ء کے درمیان گولکنڈہ میں پیدا ہوا۔ اُس کا اصل نام اسداللہ اور وجہی تخلص (۱) تھا۔ 1012ھ میں قطب شاہی دربار سے وابستہ ہو جاتا ہے (۲) اور وہ محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء قرار دیا جاتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد وجہی قطب شاہی دربار سے دور ہو جاتا ہے اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ جب عبداللہ قطب شاہ 1035ھ میں تخت نشین ہوا تو وجہی کے اچھے دن لوٹ آئے اور اُسی بادشاہ کی فرمائش پر عشق کے موضوع پر اپنی تصنیف ''سب رس'' 1045ھ میں لکھی۔ دکنی میں وجہی کی تین تصانیف ''قطب مشتری'' 1018ھ، ''سب رس'' 1045ھ اور ''تاج الحقائق'' ملتی ہیں۔ اختر حسن نے اُس کے فارسی دیوان کا تعارف اپنے ایک مضمون مطبوعہ رسالہ ''سب رس'' 1962ء میں کروادیا۔ جو بعد ازاں اُن کے مضامین کے مجموعہ ''نقد و نظر'' (مطبوعہ 1984ء) میں شائع ہوا ہے۔

قطب مشتری وجہی کی طبع زاد تخلیق ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں قطب اور مشتری کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کے مرکزی کردار قطب اور مشتری ہیں اور ثانوی کرداروں میں عطارد، زہرہ، مریخ ہیں اور کہانی اور پلاٹ کی تکمیل کی غرض سے دیو، جن اور پریوں کے کرداروں کو شامل کیا گیا ہے۔ مثنوی کے سند تصنیف میں کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ وجہی نے خود مثنوی کے آخر میں سنہ تصنیف لکھ دیا ہے۔

تمام اس کیا دیس بارہ منے
سنہ ایک ہزار ہور اٹھارہ منے
1018ھ

مثنوی قطب مشتری کے تین قلمی نسخے ملتے ہیں۔ ایک پاکستان (کراچی)، لندن (انڈیا آفس) اور تیسرا دلی میں ہے۔ اس مخطوطہ کا تعارف ابتداء میں سید محی الدین قادری زورؔ نے رسالہ ''مجلّہ مکتبہ'' میں کروایا۔

جس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تصنیف ''تذکرہ مخطوطات'' جلد سوم میں لکھتے ہیں:

''زیر نظر مخطوطہ کی اہمیت سے سب سے پہلے راقم الحروف نے
کتب خانہ انڈیا، آفس میں 1927ء میں واقفیت حاصل کی اور اس پر

ایک تفصیلی مضمون لکھ کر مجلّہ مکتبہ میں 1928ء میں شائع کیا''۔(۳)

اس کے بعد اس مخطوطے کا تعارف نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف ''یوروپ کے دکھنی مخطوطات'' میں کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس مثنوی کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں ہے۔نمبر (122/2)، ورق (58)، سائز (5x39/2)، سطر (17)، خط نسخ، تاریخ کتابت (1134ھ)۔(۴)

اس مخطوطے کا ایک اور نسخہ پاکستان (کراچی) میں موجود ہے۔ یہ وہی نسخہ ہے جس کی مدد سے مولوی عبدالحق نے مثنوی قطب مشتری کو 1939ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔ بعد میں افسر صدیقی امروہوی نے اپنی تصنیف ''مخطوطات انجمن ترقی اُردو'' جلد پنجم میں اُس کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سائز'' 8x13 ''صفحات 55، سطور 13، سنہ تصنیف 1018ھ، مثنوی قطب مشتری کے مصنف مولانا وجہی ہیں ......قطب مشتری اُن کی منظوم تصنیف ہے۔نسخہ زیر تبصرہ اگر چہ خط نسخ میں ہے''۔(۵)

وجہی کی مثنوی قطب مشتری کو مولوی عبدالحق نے 1938ء میں مرتب کیا اور 1939ء میں انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع کیا۔مولوی عبدالحق کی مرتبہ مثنوی کی تفصیلات اس طرح ہے۔4 صفحات میں فہرست مضامین جس میں 69 ابواب کا بیان ہے۔18 صفحات میں مقدمہ، 96 صفحات میں متن، 22 صفحات پر ضمیمہ اور آخر میں 20 صفحات میں فرہنگ دی گئی ہے۔ یہ مثنوی ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔

ترتیبِ متن میں سب سے اہم مقدمہ ہوتا ہے۔ ہر مرتب متن کو مرتبہ تصنیف میں مقدمہ لکھنا چاہئے جس میں مصنف کی حالت زندگی، زمانہ تصنیف، موضوع تصنیف اور مختلف مخطوطات کے بارے میں تفصیلی بحث لکھنی چاہئے۔(٦) مولوی عبدالحق کی مرتبہ تصنیف کا مقدمہ صرف 18 صفحات پر مشتمل ہے۔مندرجہ بالا عنوانات میں سے کسی بھی نکتہ پر کوئی تفصیلی بحث نہیں ملتی۔صرف چند باتوں کا ذکر سرسری طور پر کیا گیا ہے۔مولوی عبدالحق نے مثنوی ''قطب مشتری'' کو دو نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا ہے۔ چنانچہ مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''یہ مثنوی میں نے دونسخوں سے مرتب کی ہے۔ایک قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے جو بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔لیکن ناقص اور نامکمل ہےاوراول وآخراور بیچ بیچ میں سے ورق غائب ہیں۔دوسرانسخہ برٹش میوزیم لندن کا ہےجس کاعکس منگالیا گیا''۔(۷)

مرتب کو چاہئے کہ ایک متن ترتیب دینے کے لئے جتنے مخطوطات کوسامنے رکھتا ہے،اُن مخطوطات کی کیفیت پرتفصیل سے روشنی ڈالیے۔مولوی عبدالحق نے مثنوی''قطب مشتری'' کے مقدمے میں دونسخوں کا ذکر کیا ہے۔ایک قلمی نسخہ جواُن کا ذاتی نسخہ ہے اور دوسرا برٹش میوزیم لندن کے نسخے کا۔مرتب نے نہ ہی اپنے پاس والے نسخے کی کیفیت لکھی ہے اور نہ ہی لندن والے نسخے پر۔اپنے ذاتی نسخے کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے جو بہت پرانا معلوم ہوتا ہے لیکن ناقص اور نامکمل ہےاوراوّل وآخراور بیچ بیچ میں سے ورق غائب ہیں۔...... چونکہ میرانسخہ ناقص ہے اس لئے بعض مصرع صاف نہیں ہوئے اور جیسے برٹش میوزیم کے نسخے میں تھے۔ ویسے ہی لکھ دیئے گئے۔ جہاں تک میرے نسخے نے ساتھ دیا تصحیح میں دقت نہیں ہوئی۔ میرے نسخے کی دوخصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ایک تو یہ کہ وہ زیادہ بڑا ہے یعنی اس میں بعض بیانات ایسے ہیں جو برٹش میوزیم کے نسخے میں نہیں۔مثلاً سفر میں شہزادے کو جومہمیں پیش آئی ہیں وہ لندن والے نسخے میں صرف دو ہیں،اژدہےاور دیو کی لڑائی۔لیکن میرے نسخے میں سیمرغ کا بھی مقابلہ ہے۔اسی طرح اور بھی کئی مقامات میں اضافہ ہے۔اگر یہ بیانات مکمل ہوتے تو میں مثنوی کےمتن میں شامل کردیتا، اس لئے مجبوراً جتنا حصہ موجود ہے وہ ضمیمے کے طور پراضافہ کردیا گیا ہے۔بعض بعض مقامات پراشعار بھی زیادہ ہیں،وہ شعرداخل کردیئے

گئے ہیں اور اُن کے شروع میں (ن) لکھ دیا گیا ہے۔ تا کہ معلوم ہوجائے کہ یہ میرے نسخے میں سے لیے گئے ہیں۔ میرے نسخے میں ایک غزل بھی زائد نکلی جو داخل کردی گئی ہے۔ کتاب کے حاشیہ میں جو لفظ دیئے گئے ہیں وہ میرے نسخے میں ان لفظوں کا بدل ہیں جو برٹش میوزیم کے نسخے میں ہیں اور پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ میرے نسخے کے لفظ زیادہ مناسب اور برمحل ہیں۔ ایک دوسری خصوصیت میرے نسخے کی یہ ہے کہ اُس کا رسم خط عجیب قسم کا ہے۔ خط نسخ ہے لیکن الفاظ میں اکثر حروف علت کا کام اعراب سے لیا گیا ہے''۔(۸)

راقمۃ الحروف کے پاس لندن والے نسخے کا عکس موجود ہے جس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔

لندن والے نسخہ کی کیفیت

راقمۃ الحروف کے پاس لندن والا نسخہ کا عکس موجود ہے۔ مخطوطہ مکمل ہے۔ ''بسم اللہ'' سے ابتداء ہوتی ہے۔ یہ نسخہ 127 اوراق یعنی 64 صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ ہر صفحہ پر ترک موجود ہے اور ہر صفحہ پر سطور کی تعداد مختلف ہے۔ چنانچہ صفحہ 1 پر 13 سطر لکھے گئے ہیں۔ صفحہ 2 پر 17، صفحہ 3 پر 16، صفحہ 32 پر 15، صفحہ 54 پر 14 سطریں ملتی ہیں۔ داستان شروع کرنے سے قبل حمد، نعت، ذکر معراج، منقبت، عشق کا ذکر اور تعریف شعر گوئی جیسے عنوانات ملتے ہیں اور اثنائے مثنوی میں جگہ جگہ غزلیں بھی لکھی گئی ہیں۔

نسخہ میں کوئی سرخی موجود نہیں ہے۔ صرف ایک یا دو جگہ ''ح ک ای ت'' لکھا ہوا ہے اور کہیں کہیں ''ح ک ای ت'' لکھ کر قلم زد کر دیا گیا ہے۔ نسخہ میں 2088 اشعار موجود ہیں اور حاشیہ کے اشعار شامل کرنے پر مثنوی کے اشعار کی کل تعداد 2106 ہو جاتی ہے۔ حاشیہ کے اشعار ملاحظہ ہو۔

(57) ھائف خبر دے بیگ اگر دوست ہے مرا — کس رات آملے گی وہ چنچل سندھری منجے

(42) جو عاشق بلاتا ہے دیک آس تے — وہ کچھ خارج ہے رنگ ہور باس تے

(30) جو غافل اتھے وہ سب ہیچ ہوتے — دو پیالے چڑا کوچ کا کچ ہوئے

نہ ملنے نہ خونی جھگڑے کہیں — یکسکے اُپر ایک پڑتے کہیں

لگے مست ہو سٹتے مستی سنگات　　یکسکے سو پاواں اُپر ایک بات
سو یو کچ دوباراں ہوے بے خبر　　کہ پانی پیتے تھے شراب ہے کر
یکسکوں بلا ایک اُڑنا نوں سوں　　گلے لگتے تھے مست ہو چھاؤں سوں
بجا وو جو کیں تو انھیں گاے کر　　مسے مطرباں خوش خوشی یاے کر
صراحی پیالے سوں ہمدست ہو　　کراں لرتے تھے وہ دونو مست ہو
بنا مست ساقی ہو اسد گنواے　　کہ پیالا منگے تو صراحی کوں لالے
وہ مدپی کے متوال اب سخت ہوا　　اٹھاکے چلانے کیرا وقت ہوا
دیکھے شاہِ مجلس ہوی اس وفا　　کسی کوں اچھو گھر کسے دی رضا
کئے شاہ کو شاد اس وقت پر　　گئے ریاستی سب رہے مختصر
دسیں چار بالشت میں شاہ یوں　　کہ چوتھے برج میں اچھے ماہ جیوں
سو دیے میں ٹک شاہ کوں نیند آئی　　وہ نیند آ تماشے عجب کچ دکھائی
(41) یونقاش کہ شہ خبر یاے کر　　اُسے اپنے خلوت منے لیالے کر
سنگات اپنے بٹلا اُسے چاوسوں　　لگے کرتے تعظیم بھو بھاؤ سوں
کہے تو جو دیکھیا جتیاں سندریاں　　سلکھن جھمیلیاں چنچل چھند بھریاں
تجے کوں اننیاں میں خوش آئی ہے　　تجے کون کہہ سندھری بھائی ہے
(51) محبت او پیچ نوں کر نکوں　　گریگا تو رسوائی نے ڈر نکوں

ترقیمہ سے قبل فارسی میں ایک رباعی بھی ملتی ہے۔ رباعی ملاحظہ ہو:

روز ہے مرگ دامن عمرم رہا کند　　وین نیرہ خاک بند زیندم جد اکند
یا رب نگاہ دار تو ایمان انکے　　کین خط منے بخواند و بر منے دعا وکند
نوشتہ بماند سیہ بر سفید　　نو شنیدہ راغیت فردا امید
تو نسٹتم مئے بر این کاغذ لال　　خدا روز کے کتہ دیدار فی الحال
این چھان شابہ است کروند　　شابہ کہ لیش وکاہ پس باشد

نیکوی کن جو دست اس داری　　　　نہ ہمہ وقت دست رس باشد
زین چھان کر زحیزہ مطبی　　　　نام نیکوئی زخبرہ پس باشد

کاتب:

این رسالہ حاجی محمد رضا ولد، محلو (کذا محمد) بیگ
بن محمد کریم مازندانے در شہر حیدرآباد قلم زد
1134ھ

مولوی عبدالحق کی مرتبہ تصنیف کا مطالعہ کرنے کے بعد کئی ایسے نکات ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ کیا مولوی عبدالحق نے سچ میں لندن والے قلمی نسخے کا عکس منگوایا تھا کیوں کہ انھوں نے لندن والے نسخے کا نام اپنے مقدمے میں برٹش میوزیم لندن لکھا ہے۔ اور متنِ کتاب میں اُسی نسخے کو انڈیا آفس (صفحہ 12) کا نسخہ لکھا ہے۔ سید محی الدین قادری زور نے اپنی تصنیف ''اُردو مخطوطات جلد سوم'' اور نصیرالدین ہاشمی نے اپنی تصنیف ''یوروپ میں دکنی مخطوطات'' میں مثنوی ''قطب مشتری'' کے مخطوطے کو انڈیا آفس کا نسخہ لکھا ہے۔ سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر مخطوطے کی اہمیت سے سب سے پہلے راقم الحروف نے
کتب خانہ انڈیا آفس میں 1927ء میں واقفیت حاصل کی''۔(۹)

نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''اس مثنوی کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں ہے۔ قطب مشتری کا
نسخہ جہاں تک میرے معلومات ہے کسی کتب خانہ میں نہیں ہے اس لئے
انڈیا آفس کا یہ نسخہ خاص اہمیت رکھتا ہے''۔(۱۰)

ان اقتباسات کا مطالعہ کرنے کے بعد مولوی عبدالحق کی بات پر شبہ ہوتا ہے کہ انھوں نے لندن کے نسخے کا عکس منگوایا تھا۔ اگر وہ لندن کے نسخے کا عکس منگواتے تو مثنوی ''قطب مشتری'' کے نسخے کو دو جگہ الگ الگ ناموں سے نہیں لکھتے۔ اسی طرح مولوی عبدالحق نے اختلافِ نسخ درج کرنے میں بھی بہت اُلجھن دکھائی ہے کیوں کہ ترتیبِ متن میں ایک سے زائد نسخے اگر مدون کے پاس موجود ہو تو ایسی صورت ایک نسخے کو بنیادی نسخہ

قرار دیے اور باقی تمام نسخوں کو تصحیحِ متن کے لئے استعمال کریں۔

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی تصنیف ''تحقیق کا فن'' میں اور رشید حسن خاں نے اپنی تصنیف ''ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ'' میں لکھتے ہیں کہ کسی بھی متن کو لقب کرتے وقت اہم اختلاف نسخ کا دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ایسی صورت میں جب مرتب کے پاس ایک سے زائد نسخے موجود ہوتو مرتب کو چاہئے کہ وہ اپنے طریقہ کار کا ذکر بھی مقدمے میں کردے۔مولوی عبدالحق اپنے طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''بعض بعض مقامات پر اشعار بھی زیادہ ہیں۔ وہ شعر داخل کردیئے گئے ہیں اور اُن کے شروع میں (ن) لکھ دیا گیا ہے تا کہ معلوم ہوجائے کہ یہ میرے نسخے سے لئے گئے ہیں''۔(۱۱)

مولوی عبدالحق نے اپنی مرتبہ مثنوی قطب مشتری میں 94 اختلاف نسخ درج کئے ہیں۔انھوں نے اختلافِ نسخ درج کرنے میں یہ طریقہ رائج کیا تھا کہ اگر حاشیہ میں اُن کے ذاتی نسخہ کا لفظ یا مصرع ہوتو اُس کے سامنے (ن) لکھ دیا ہے تا کہ معلوم ہوجائے کہ یہ مولوی عبدالحق کے ذاتی نسخہ میں ہے۔مگر فاصل مرتب نے کئی ایسے مقامات پر اختلاف نسخ درج کرتے وقت (ن) نہیں لکھا جس کی وجہ سے اختلاف نسخ میں ایک اُلجھن پیدا ہوئی ہے۔ذیل میں دونوں نسخوں کا متن محاذی درج کیا جاتا ہے:

	(لندن)ل	(مطبوعہ)م
1-	تھیں باسط ہے ہور تو نہیں قریب تھیں قابض ہے ہور تو نہیں مجیب	یہ شعر مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے۔
2-	غرض ایک آپیچ سب ٹھار ہے اسی نور کا سب میں جھلکار ہے	اس شعر کے بعد لندن والے نسخہ میں ''حکایت'' کی سرخی ملتی ہے۔جب کہ مطبوعہ نسخے میں اشعار سلسلہ وار لکھے گئے ہیں۔
3-	ولے مہیتوں پی کیس پرکھیں نا پڑے لہ ارزق سب کوں سدا انپڑے	مطبوعہ نسخہ میں یہ شعر اس طرح ہے۔ ولے مہینوں پی کیس پڑے یا پڑے ترا رزق سب کوں سدا انپڑے

4- تو ماریا ہے کفار کوں اکے جاں
چھری لہو کی اجنوں ابلتی ہے واں

یہ شعر مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے۔

5- نپایا ہے شادی کوں غم میں نے کوں

بنایا ہے شادی کوں غم میں نی کوں
مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ اُن کے نسخہ میں لفظ (ن) ''نپاتا'' لکھا ہے۔اور لندن والے نسخہ میں لفظ ''بنایا' ہے جب کہ لندن والے نسخے میں بھی لفظ ''نپایا'' ہی لکھا ہوا ہے۔

6- سلاست نہیں جس کیری بات میں

ثلاثت نہیں جس کیری بات میں

7- دیواتا ہوں میں اس رنگی بات کا
کدھر و دل میں جبوں ہوکرے ٹھارا

دیوانا ہوں میں اس رنگی بات کا
ادا نیں کیا کوی اس دھات کا

8- ثواباں سوں توں منج کوں سنپورکر

ثواباں سوں توں منج کوں پرنور کر
مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ لفظ ''پرنور'' لندن والے نسخہ میں ہے اور حاشیہ میں لفظ (ن) سنپور لکھا ہوا ہے جب کہ لندن والے نسخے میں بھی لفظ ''سنپور'' ہی لکھا ہوا ہے۔

9- نولا میں ہوا نازک کہاں ہور موسل جیسے لاٹ
چندن کیری رتی بھلی نا بھار ابھر کا کاٹ

مطبوعہ نسخے میں یہ شعر حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ یہ شعر اس مثنوی کا نہیں ہوسکتا۔

10- لندن والے نسخہ میں یہ شعر نہیں ہے۔اور مطبوعہ نسخہ میں یہ شعر حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

ترا کام ہے سو کیا فام میں
نکو ڈر کروں گا کرا کام میں

11- کسے باس ہے ہور کسے رنگ ہے کسے باس رنگ ہوا بھی سنگ ہے	کسے باس ہے ہوا کسے رنگ ہے کسے باس ہور رنگ بھی سنگ ہے
12- لندن والے نسخے میں کوئی سرخی موجودنہیں ہے۔اشعار سلسلہ وار لکھے گئے ہیں۔	(سرخی) ''تعریف کردن عطارد پیش مشتری ازمحمد قلی قطبؔ''۔
13- نہ کوئی سکی اُس سات دندسارنے اچل کا نہیں کام اُسے مارنے	نہ کوئی سکی اب اس سوں دند سارنے کہ اُسکوں اجل نہیں سکی مارنے (سرخی) ''درمناجات باری تعالیٰ جل جلالہٗ''
14- لندن والے نسخے میں کوئی سرخی موجودنہیں ہےاوراشعار سلسلہ وار لکھے گئے ہیں۔	

وہ مدپی کے متوال اب سخت ہوا — اٹھا کے چلانے کہرا وقت ہوا (ص30)

دیکھئے شاہ مجلس ہوئی اس وضا — کسی کو اچھو گھر کسے دی رضا (ص30)

سٹیا راحت اپنا نپٹ دیہ کا — کہ جوں حق ہے تبوں پنت چلیا نیہ کا

ھاتف مجے خبر دے اگر دوست ہے مرا — کس رات آملے گی وہ چنچل سندر مجے (ص57)

کسی شاہ اپنی یوں اس نارکوں — چمک کھینچ لینا ہے جیوں سار کوں (ص96)

نہ جانو کہ بو نقش کیا سحر ہے — کہ ہر دل میں اس نقش کا مہر ہے (ص96)

کتا میں رکھوں دل میں تا بول کر — کتی ہوں تیرے پاس اپ کھول کر (ص97)

کہ بو بھید کرتوں تجے فام ہے — کہہ تجسوں انگے لئی منجے کام ہے (ص97)

بھنواں دوجیوں احال ہورالک کی کنڈلاں جزماں — تلک آیت ہےتل مطلق دسے جید پیاراہوا (ص83)

تھوڑا بھوت جاتی ہے بھی جان گئے — مری بات توں ساچ کر مان گئے (ص1)

مولوی عبدالحق نے مثنوی کے متن میں 10 اشعار کو (ن) لگا کر لکھا ہے یعنی یہ اشعار صرف مولوی عبدالحق کے ذاتی نسخہ میں موجود ہیں اور لندن والے نسخہ میں نہیں۔ راقمۃ الحروف کے پاس لندن کے نسخے کا

عکس موجود ہے۔ جانچنے کے بعد صرف دو اشعار لندن والے نسخے میں نہیں ملتے اور بقیہ کے 8 اشعار لندن کے نسخے میں موجود ہیں اور جو دو اشعار لندن والے نسخے میں نہیں ہیں وہ اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں تا کہ پوری وضاحت ہو جائے۔

ستیا راحت اپنا نپٹ دبہ کا   کہ جوں حق ہے تبوں نپٹ چلیانیہ کا (ص41)

تھوڑا بھوت جاتی ہے بھی جان گئے   مری بات تو ساچ کر مان گئے (ص70)

مولوی عبدالحق کی انہی اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید محی الدین قادری زور نے اپنی تصنیف ''تذکرۂ مخطوطات جلد سوم'' میں لکھتے ہیں:

> ''مولوی صاحب نے لندن کا نسخہ دیکھا ہی نہیں۔ اگر وہ دیکھتے
> یا اُس کا عکس منگاتے تو ابیات مندرجہ بالا کی غلطیوں کے علاوہ حسب
> ذیل اُمور میں بھی اختلاف باقی نہ رہتا۔(۱۲)

مولوی عبدالحق نے مقدمے میں اِس امر کا بھی انکشاف کیا ہے کہ اُن کے مملوکہ قلمی نسخے میں ایک غزل لندن کے قلمی نسخے سے زائد موجود ہے۔ مقدمے میں قابل مرتب نے مذکورہ غزل درج نہیں کی ہے۔ جو غزل اس نسخے میں زائد ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے تا کہ وضاحت مکمل ہو جائے۔

جس یار کو میں منگتی ہوں وہ یار کہاں ہے
سرسوں سکی چل جاتی ولے ٹھار کہاں ہے
دل ہات میں تھی چھین لیکر نھاٹ گیا ہے
وہ یار دغا باز جھونٹے مار کہاں ہے
مشتاق کے بازار میں ، میں بیچتی ہوں جیو
دلال کدھر ہوا خریدار کہاں ہے
عاشق نو مچ ایسے سکی لا کہاں ہیں ولیکن
معشوق سو اس دور میں اس سار کہاں ہے
دبدے مرے نادیدے جو دیدار دیکھے تھے
مج صبر دیو نہار وہ دیدار کہاں ہے (صفحہ 74)

اختلاف نسخ درج کرتے ہوئے مرتب کو کہیں کہیں قیاسی تصحیح سے بھی کام لینا ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے پوری مثنوی میں صرف مرتبہ قیاسی تصحیح سے کام لیا ہے جو بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

1- ترا مر .... جگ میں بھرپور ہے
ہر یک ٹھار روشن ترا انور ہے (صفحہ 3)

مولوی عبدالحق نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''یہاں لفظ مٹ گیا ہے۔ غالبًا ''معرفت'' ہوگا۔(13) یہاں پر مرتب نے قیاسی تصحیح سے کام لیا ہے اور یہاں ''معرفت'' کا لفظ بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

2- اچھوں یاں تی پھر جائیں تو خوب ہے
کہ حیفی انگے کھائیں تو خوب ہے (صفحہ 45)

مولوی عبدالحق نے حاشیہ میں لکھا ہے ''اصل نسخے میں ''خوب'' لکھا ہے۔ غالبًا ''معیوب'' ہوگا۔ (ص 14) اصل نسخے میں (یعنی مولوی عبدالحق والا نسخہ) اور لندن والے نسخے میں خوب ہی لکھا ہوا ہے۔ لیکن مرتب نے ''خوب'' کے بجائے ''معیوب'' لکھا ہے۔ اور شعر کے مفہوم کے لحاظ سے لفظ ''معیوب'' بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔

3- تمہیں پادشہ ہیں جھوٹے یاں نہ آؤ
کہ یو ٹھار کچھ خوب نہیں نیک جاؤ (صفحہ 46)

مولوی عبدالحق نے حاشیہ میں غالبًا ''بیگ'' ہوگا۔ (ص 15) لکھا ہے۔ اس شعر میں لفظ ''نیک'' کے بجائے ''بیگ''، صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ''بیگ'' کے معنی جلدی جانے کے ہیں۔

اگر مخطوطہ کرم خوردہ ہو یا کسی اور وجہ سے الفاظ مٹ گئے ہو تو مرتب کو ایسے موقع پر قیاسی تصحیح سے ہی کام لینا ہوتا ہے۔

ترتیبِ متن میں مقدمہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ مرتب کو اپنی ہر بات مقدمے میں ہی کہنی ہوتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ترتیبِ متن میں مقدمہ ''دل'' کی اہمیت رکھتا ہے۔ مثنوی ''قطب مشتری'' کا مقدمہ صرف اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے اور مقدمے میں کسی نکتے پر کوئی بحث نہیں ملتی۔ مولوی عبدالحق نے مثنوی قطب مشتری کے مقدمے میں سبب تصنیف پر کوئی بحث نہیں کیں۔ صرف اتنا ہی لکھا ہے:

''گویہ یہ مثنوی اعلیٰ پایہ کی نہ ہو، تاہم اس میں بعض باتیں خوبی کی ہیں''۔(ص16)

مثنوی ''قطب مشتری'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو چند باتیں نہیں بلکہ کئی باتیں بڑی خوبی کی ملتی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وجہی نے یہ مثنوی صرف بارہ دن میں لکھی ہے۔ مثنوی کی ابتداء حمد سے ہوتی ہے۔ حمد کے بعد نعت، ذکرمعراج اور منقبت کا ذکر ملتا ہے۔ وجہی نے بادشاہِ وقت کی مدح سے پہلے دو باب ''در صفت عشق گوید'' اور ''درصفت شعر گوید'' کا اضافہ کیا ہے۔ پھر اصل قصّے کا آغاز ہوتا ہے۔

جب مثنوی کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو وجہی کی وجہ تصنیف پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مثنوی میں عشق کی داستان پیش کی گئی ہے اور اس مثنوی کا ہیرو محمد قلی قطب شاہ ہے۔

اس مثنوی کو لکھنے کا مقصد وجہی کا صرف اور صرف بادشاہِ وقت کی مدح کرنا تا کہ زیادہ سے زیادہ انعام و اکرام حاصل کرسکیں۔ جہاں وجہی نے اس مثنوی میں محمد قلی قطب شاہ کی تعریف کی ہے وہیں شاعرانہ تعلّیٰ سے بھی کام لیا ہے۔ اس مثنوی کو لکھنے کی اہم وجہ شاعرانہ تعلّیٰ بھی ہے۔ وجہی شاعرانہ تعلّیٰ کے ساتھ اپنی شاعرانہ عظمت کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے:

نہ نیچے نہ نچیا ہے گن گیان ہے   سوطوطی منج ایسا ہندوستان میں
کہ باتاں بوسن کر مری گیان کہاں   دھیان ٹھک ھو قمریاں خراساں کیاں
جتے شاعراں شاعر ہو آینگے   سو منج تی طرز شعر کا پاینگے

اگر غوطے لک برس غواص کھائے   تو یک گوھر اس دھات امولک نہ پائے
یہ موتی نہیں ووجو غواص پائیں   بو موتی نہیں وو جو کس ھات آئیں
غواصاں کئے غوطے کھا کھاتے کر   مولے ھیں سو اس سمد میں آئے کر

مثنوی ''قطب مشتری'' میں ایک اہم نکتہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے عشق کا بھی ہے۔

مثنوی ''قطب مشتری'' کا مقدمہ لکھتے ہوئے مولوی عبدالحق تذبذب کا شکار معلوم ہوتے ہیں۔ موضوع تصنیف پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے مقدمے میں اپنی بات اس جملے سے شروع کی ہے کہ ''اس مثنوی میں در پردہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے مشہور عشق کی داستان بیان کی گئی ہے''۔(ص 17) لیکن موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ''مثنوی میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں بھاگ متی کے عشق سے اُن کا کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ وجہی کا مقصد اس مثنوی کے لکھنے سے بادشاہ کے حسن و جمال، شجاعت اور لیاقت کی تعریف کرنا ہے اور بس''۔(ص18)

''دکنی کے کئی محققین اسی رائے پر اتفاق رکھتے ہیں جن میں سید محی الدین قادری زور (دکنی ادب کی تاریخ ص 52، اُردو شہ پارے ص 92)، جمیل جالبی (تاریخ ادب اُردو، جلد اوّل ص 435)، رفیعہ سلطانہ (اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص256)، اور رشید حسن خاں (اُردو کی تین مثنویاں ص 36) ہیں''۔

لیکن پروفیسر ہارون خان شیروانی، پروفیسر سیدہ جعفر، ڈاکٹر صفدر امام قادری، ڈاکٹر صفی اللہ اور ڈاکٹر حبیب نثار نے بھاگ متی کے وجود کو خیالی ثابت کیا ہے۔ جب مرکزی کردار کا وجود ہی معدوم ہے تو عشق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ بات سچ ہے کہ اس مثنوی کا ہیرو قطب شاہ ہے اور اُسی کی مناسبت سے مثنوی نگار نے مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد جیسے کردار لائے ہیں جو کہ سیاروں کے نام ہیں جہاں تک ہیرو کو قطب شاہ کے نام سے موسوم کرنے کا سوال ہے تو وہ بھی ایک سیارہ ہی کا اسم خاص ہے اور ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وجہی کے لئے بادشاہِ وقت کی مدح کرنا بھی ضروری تھا کہ زیادہ سے زیادہ انعام و اکرام حاصل کر سکے۔ اور وجہی کی اس سعی سے بعض محققین کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

جہاں قدیم متن کو ترتیب دینا ہوتا ہے۔ وہاں ایک اہم مسئلہ الحاقی کلام کا بھی ہوتا ہے۔ ہر زبان میں الحاقی کلام کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ کبھی نام یا تخلص کی وجہ سے ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر کے کلام میں منتقل ہو جاتا ہے۔ کبھی تصانیف کی ہم نامی یا ہم آہنگی اس کا باعث بن جاتی ہے۔ عربی، فارسی اور اُردو وغیرہ میں الحاقی کی ایک بڑی وجہ شاعروں کا تخلص ہوتا ہے۔ جن زبانوں میں ایک ہی تخلص کے کئی شاعر ہوتے ہیں ان میں ایک تخلص کے شاعر کے اشعار اُس کے ہم تخلص شاعر کے نام سے مشہور ہو جاتے ہیں۔

الحاقی کلام کی ایک صورت سرقہ یا تصرف بھی ہے۔اس کی بھی کئی مثالیں علم وادب کی تاریخ میں مل جاتی ہیں۔الحاقی کلام کواصلی متن سے علیحدہ کرنے کے لئے سب سے زیادہ مددگار اندرونی شہادتیں، اسلوب اور شاعر کے لفظیات،فن پارےاورالہامی کلام،شاعرکا زمانہ اوردوسرے تخلیقات سے الحاقی تحریروں کا پتہ چلتا ہے اور یہ سب مقدمہ میں بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔مولوی عبدالحق نے مثنوی ''قطب مشتری'' کے مقدمے میں الحاقی کلام پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔اُن کا کہنا ہے:

''اس میں (نسخہ میں) بعض بیان ایسے ہیں جو برٹش میوزیم کے نسخے میں نہیں۔مثلاً سفر میں شہزادے کو جومہمیں پیش آتی ہیں وہ لندن والے نسخے میں صرف دو ہیں۔اژدہے اور دیو کی لڑائی۔لیکن میرے نسخے میں سمرغ کا بھی مقابلہ ہے۔اسی طرح اور بھی کئی مقامات میں اضافہ ہے۔اگر یہ بیانات مکمل ہوتے تو میں مثنوی کے متن میں شامل کردیتا۔اس لئے مجبوراً جتنا حصہ موجود ہے وہ ضمیمے کے طور پر اضافہ کردیا گیا ہے''۔(۱۹)

جب ضمیمے والے حصہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مثنوی ''قطب مشتری'' سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔مثنوی کا یہ زائد حصہ ہے جو کراچی کے نسخے میں ملتا ہے۔اس ضمیمہ میں شامل ابیات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک الحاقی کلام ہے۔جو کسی طرح اس مثنوی میں شامل ہوگئی ہے۔اس زائد عبارت کی لفظیات، اسلوب و بیان، ثقیل و بے جور الفاظ کی پیوندکاری، مثنوی قطب مشتری سے بالکل الگ ہیں۔وجہی نے مثنوی قطب مشتری میں قلی قطب شاہ کو شاہ یا شہنشاہ کہہ کر مخاطب کیا ہے۔جب کہ ضمیمے میں شامل قصہ کے ہیرو کو ہمیشہ ''شہزادہ کہا گیا ہے۔''قطب مشتری''میں محمد قلی قطب شاہ کو بہادر، دلیر، باوقار کہا گیا ہے اور ضمیمے میں شامل قصہ کا ہیرو کمزور، بے بس ولاچار بتایا گیا ہے۔انہی سارے نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک الحاقی کلام ہے جس کو مولوی عبدالحق نے پوری طرح نظرانداز کردیا ہے۔اگر وہ ذرا سا بھی اِن اُمور پر غور کرتے تو ضرور اِس کو مثنوی ''قطب مشتری'' میں کبھی شامل نہیں کرتے۔

ترتیبِ متن میں کسی بھی مصنف کے متن کو مرتب کرتے وقت اُس کے کلام پر تبصرہ کرنا اور مقدمے میں

محاسن اور معائب دونوں کا تفصیلی جائزہ لینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے مثنوی ''قطب مشتری'' کے مقدمہ میں وجہی کے کلام پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ چند باتوں کا ذکر سرسری طور پر کیا ہے۔

وجہی نے مثنوی ''قطب مشتری'' میں منظر نگاری کا پورا حق ادا کیا ہے۔ کئی مقامات پر مناظرِ قدرت کے تحت باغوں کی شادابی، پرندوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کی طراوت، فواروں کی جھلمل کو اتنی خوبی سے پیش کیا ہے کہ کہیں بھی مبالغہ کا شبہ نہیں ہوتا۔ مولوی عبدالحق نے ''قطب مشتری'' کے مقدمے میں منظر نگاری کی تفصیل پیش کی ہے اور مقدمے میں اس طریقہ کار کو اپنایا ہے کہ وہ کوئی بھی بات کہنے سے پہلے اشعار لکھ دیتے اور بعد اُن اشعار کا خلاصہ عام الفاظ میں پیش کرتے تا کہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ جیسے:

یکا یک دیسا ایک نزدیک باغ ہوا اُس کی باساں تے قریب دماغ
کہ پاتاں کہ پردیاں کو سب پھاڑ کر پھلاں جھانکتے تھے سراں کاڑ کر
دو بازو دو دھر جھاڑ دو رست ہو پون مدسوں ڈلتے تھے سب مست ہو
سروداں سو مرغاں کے نالے نھے واں صُریاں، کلیاں، پھول، بیالے تھے واں
سورنگ سانولے خوب پاتاں بھرے ندیم ہو کے بلبل جو چالے کرے
سو طاؤس پنکھی طوطی، کیک، ھنس پکڑ پیٹ اُڑنے لگے ھنس ھنس
وو سب خوش ہو بلبل کے چالیاں اُپر اچھلتے اتھے مست ہو ڈالیاں اُپر
بھنور جھونڈ ہو بن میں گھمتے اتھے سو پھولاں کرے سوکھ چمتے اتھے
چمن ترنہ شبنم کے ھے آب سوں کہ موں دھوئے ھیں پھول گلاب سوں
برگ بار آئے ہیں اس دھات سب کہ چھپ گئے پھلاں کے تلیں پات سب
خزاں کوں نہ تھا آنے اس ٹھار ٹھار بہار ھور بتیرا تھا سب بہار'' (۲۰)

خلاصہ ملاحظہ ہو:

''یعنی قریب ایک باغ نظر آیا جس کی خوشبوؤں سے دماغ معطر ہو گئے۔ پھول، پتوں کے پردوں کو پھاڑ کر سر نکال نکال کر دیکھ رہے تھے۔ دونوں طرف پیڑوں کی دو قطاریں تھیں جو ہوا کی مستی سے جھوم

رہے تھے۔ پرندوں کے نالے سرود تھے۔ کلیاں، صراحیاں تھیں اور پھول پیالے تھے۔ باتونی خوش رنگ، سانولی بلبلیں وہاں ندیم تھیں۔ اور طرح طرح کے ناور و انداز کر رہی تھیں۔ جنھیں دیکھ کر مور، طوطے، کبک اور ھنس مارے ھنسی کے لوٹے جاتے تھے۔ وہ سب بلبلوں کے ناز و انداز سے خوش ہو کر ڈالیوں پر مست ہو ہو کر اچھلتے تھے۔ بھونروں کے جھنڈ گھومتے پھر رہے تھے۔ چمن اوس سے بھیگا ہوا نہ تھا۔ بلکہ پھولوں نے گلاب سے منہ دھوئے تھے۔ پھول اور پھل اس کثرت سے آئے ہیں کہ پتے پھولوں کے تلے چھپ گئے ہیں۔ خزاں کو اس مقام پر آنے کی اجازت نہ تھی اور اندر اور باہر بہار ہی بہار تھی''۔ (۲۱)

اس کے علاوہ مثنوی میں ہجر و فراق کی کیفیت، رنج و غم، جدائی و بے کسی کا بیان بھی ہے۔ مثنوی کا ایک ایک لفظ سوز و گداز، آہ و فغاں میں ڈوبا ہوا ہے۔ وجہی نے رنج و ملال کی ان تصویروں کے ذریعہ اتنی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں پیش کی ہیں کہ آنکھوں کے سامنے اُن کی تصویر اُتر جاتی ہے اور قاری اپنے آپ کو اُس جگہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہی کی مکالمہ نگاری کی سب سے بڑی خوبی ہے جس کی ایک دو مثالیں مولوی عبدالحق نے مقدمہ میں پیش کی ہیں:

''یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ تو سورج ہے آسمان سے دور نہ ہو۔ تو پھول ہے اور تیرا مقام پھول بن (باغ) ہے، تو سرو ہے اور تیری جگہ چمن میں ہے۔ تو شاہی بزم کی شمع ہے، تو سدا سلامت رہے کہ تو ہی میری پونجی ہے تو اپنے دل کو پریشان نہ کر اور خاطر جمع رکھ اور روشن شمع کو نہ بجھا۔ جسے یار کہتے ہیں وہ کہیں نہیں پایا جاتا اور کہیں ہے تو وفادار نہیں۔ اگر کوئی وفادار ہے تو وہ خدا پروردگار ہے، تجھے یاری کرنی ہے تو اس سے کر''۔ (۲۲)

ان باتوں کا جواب شہزادہ ان الفاظ میں دیتا ہے۔ آگے لکھتے ہیں:

''جب شہزادہ رخصت ہوتا ہے تو وہ مقام کس قدر دردناک ہوجاتا ہے۔شہزادہ ماں باپ سے کہتا ہے کہ میں دل کے ہاتھوں لاچار ہوں اور اب نہیں رہ سکتا۔ یہ شعر موقع کے لحاظ سے نہایت سچے اور پُراثر ہیں''۔

نکلنا کسے گھر سے بھاتا اے ۔۔۔ منجے دل یو ستمی لجاتا اچھے
کتا میں رکھوں دل کو رہتا نہیں ۔۔۔ یو کیا بھید ھے کوئی کہتا نہیں
بھوت منج کوں لگتا اچھے یو عجب ۔۔۔ کہ آدم پہ غالب ھے دل کیا سبب
منجے یاں رہتا بھوت مشکل اچھے ۔۔۔ کہ اتنا کیا سب سو یہ دل اچھے''(۲۳)

وجہی کی مکالمہ نگاری ایک اور اچھی مثال دائی کی نصیحت ہے۔ جب مشتری نقش ونگار دیکھنے آتی ہے تو اُس کی نظر اچانک اُس تصویر پر پڑتی ہے اور وہ پہلی ہی نظر میں عشق کے تیر سے گھائل ہوجاتی ہے۔تب دائی کہتی ہے:

توں چنچل چتر نار اتنی سی ھے ۔۔۔ بڑی چھند بھری ، بھوت فتی سی ہے
یو کہا اچھے عشق جوتوں کری ۔۔۔ بھلی ہے توں شاباش جو نیں ڈری
پرت پنت میں توں نوی آئی ہے ۔۔۔ ابھو تیہ کے چرکے نہیں پائی ہے
عشق بازی دھن کچھ نھا کام نہیں ۔۔۔ ننھی ھے نوں اجنوں تجے فام نیں
کچی توں تجے بد پچی آئی ہے ۔۔۔ کہ کانداں کے نقشاں سوں جیولائی ہے
توں اس نقش کوں عشق سازی اچھے ۔۔۔ یونیہ نیں ھے طفلاں کی بازی اچھے
عشق کیا ہے کر کے پچھانی ھے توں ۔۔۔ گڑیاں کا مگر کھیل جاتی ہے توں
رنگے عشق کیا ہے سو جانے گی توں ۔۔۔ بڑی ھوے گی تو پچانے گی توں
توں صورت ستی جیو کیا لائی ہے ۔۔۔ توں صورت منے معنیٰ کیا پائی ھے
اگر معنی سوں جیوتوں لائے گی ۔۔۔ تو صورت تھے پھل بھی توں کچ پائے گی (۲۴)

اس کے جواب میں مشتری کہتی ہے جس کا ذکر مولوی عبدالحق مقدمہ میں اس طرح کرتے ہیں:

''میں نے اِس صورت میں کچھ حسن سیرت بھی دیکھا ہے۔ تبھی
تو اس سے دل لگایا ہے۔ میرا تو یہ حال ہے اور اُس پر تو میرے پیچھے
پڑی ہے سچ ہے دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ تیری یہ دلسوزی مجھے اچھی نہیں
لگتی۔ میں دیوانی ہوں۔ مجھے پند نہیں بھاتی۔ غرض اس طرح کہتے کہتے
آخر میں یہ کہتی ہے''۔

غرض ایسی باتاں سے کیا ہے تجے | نصبیاں منے تھا سو انپڑیا مجھے
نہ کوئی عشق کوں لیا نہارا اچھے | کہ یوں عشق اپے آنہارا اچھے
جہاں عشق ہے واں ہے حیران سب | اخل ھور فہم سُدبُد گیان سب
نہ جاسی پرت منج نے اب چھوٹ کر | کہ دل لے گیا ہے مرا لوٹ کر
بو فریاد میں کس کنے جا کروں | نہ ہوتا اتھا ھور ھوا کیا کروں (۲۵)

آگے کہتے ہیں:

''اس میں خوبی یہ ہے کہ دونوں کی گفتگو موقع کے مناسب اور
موافق فطرت ہے اور کسی قسم کا تصنع یا تکلیف نہیں پایا جاتا۔ اس قسم کی
باتیں وہ بے تکلفی سے کئی جگہ لکھ گیا ہے''۔(۲۶)

اس تمام بحث کے باوجود مقدمہ میں سراپا نگاری، کردار نگاری اور پلاٹ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ''مثنوی قطب مشتری'' میں محمد قلی قطب شاہ اور مشتری مرکزی کردار ہیں۔ ان کے علاوہ عطارد، زہرہ، مریخ اور دائی ثانوی کردار ہوتے ہوئے بھی مثنوی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے نہ تو محمد قلی قطب شاہ کے کردار پر روشنی ڈالی اور نہ ہی مشتری۔ جب کہ عطارد، زہرہ اور مریخ کا کردار کہانی کے پلاٹ کو آگے بڑھانے اور کہانی میں نئی جان ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی داستان ہو یا مثنوی کردار نگاری کا بہت اہم رول ہوتا ہے اور کہانی کا پورا دارومدار انہیں کرداروں پر منحصر ہوتا ہے۔ کسی بھی متن کو مرتب کرتے ہوئے ان تمام اُمور پر تفصیلی بحث کرنا بہت ضروری ہوتا ہے اور تب ہی مقدمہ نگاری کا پورا حق ادا ہوسکتا ہے۔

وجہی کے جمالیاتی احساس کا شعور اس مثنوی میں شامل صنائع و بدائع سے ہوتا ہے۔ وجہی نے اس سلسلے

میں اپنے مطالعے، تخیل ومشاہدے کا سارا نچوڑ سمو دیا ہے۔ کیوں کہ مثنوی ''قطب مشتری'' میں شامل تشبیہات و استعارات میں حسن آفرینی، بلاغت اور معنیٰ آفریں کے علاوہ تازگی، شگفتگی اور ندرت کی بھی آمیزش موجود ہے۔ مثنوی کے ہر چوتھے یا پانچویں شعر میں کوئی نہ کوئی اچھوتی تشبیہ یا استعارہ نظر آتا ہے۔ ''قطب مشتری'' کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجہی اُن کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مثنوی ''قطب مشتری'' میں شامل تشبیہات و استعارات قاری کے ذہن پر خوش گوار اور دیر پا اثر قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ وجہی نے مختلف مضامین کو جس کمال سے نئے نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اس کی قادرالکلامی کا ثبوت ہے۔ مولوی عبدالحق نے مثنوی ''قطب مشتری'' کے مقدمے میں تشبیہات و استعارات اور ضرب الامثال پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے مگر مثنوی میں موجود کہاوتیں اور تلمیحات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔

محاورے اور کہاوتیں:

نکو بول مضمون توں ہوں کار — کہ کالا ہے دو جگ میں موں چور کا (ص ۴۱)

کتا ہوں سنو کان دھر لوگ — کہاوت منے بات جو آئی سو (ص ۱۵)

پڑے ہات جاں اس بجنت وار کا — سُنا ہوئے مائی سو اُس تھار کا (ص ۱۷)

چھپی بات کے پردے کوں کھولنے — اپس میں ایسے یوں لگے بولنے (ص ۲۳)

اپس دل کی توں گاٹ اب کھول شد — ترا حال یوں کی ہوا بول شہ (ص ۲۶)

جو ماں کی بی نیں بات شرٹک سنیا — ہزاراں نقش ناصحاں پر چنیا (ص ۳۹)

پُنم چاند جیوں دوند گھٹنے لگے — ستارے انکھیاں میں تے تٹنے لگے (ص ۴۸)

ہوا رام میں دل میرا رام تیں — یوں دل کیا کرے گا منجے فام نیں (ص ۴۶)

نگر میں جو آیا قطب شاہ نول — لگے بجنے چوندھیر خوشیاں کے طبل (ص......)

کہ میں سرسوں چل وان تلک جاؤں گی — اپی میں یہاں شاہ کوں لیاؤں گی (ص......)

انگے بائیں ہے ہو رتچھیں کوا — اندیشہ نکو کر ہوا سو ہوا (......)

دیکھیں کام اس ہور تج بات آج — کہ مثلاً ہے ایک پنت ہور دو کاج (......)

ترا ہور میرا سویک حال ہے دو مچھلیاں بچاریاں کوں یک جال ہے (ص۴۷)

ذیل میں چند کہاوتیں اور تلمیحات اس طرح ہیں:

جو یوسف کی عاشق زلیخا نہ ہوئی نہ کرتا اُسے آج لگ یاد کوئی

ایاز ہور محمود جو دو اہیں سو مشہور اس عشق نی ووا ہیں (ص۱۱)

کہ لیلیٰ و مجنوں جو کہوائے ہیں سو اس عشق تے نانوں یوں پائے ہیں (ص۱۱)

سلیماں نے فاضل ہے اُس بخت بل بدی، دیو، جن، سب ہیں اُس حکم نل (ص۱۶)

اپنچ تیج لیایا وو اپنے سنگات سکندر کے طالع خضر کی حیات (ص۱۶)

اُسے ایک زہرا سگی بہان ہے سو داؤد تے وو خوش الحان ہے (ص ۳۱)

سکندر پڑیا تھا جو ظلمات میں رہیا تھا بلا کے سنپڑ ہات میں (ص۳۴)

سہاتی ہے دھن شاہ خوش فام سو کہ گمنی ہے سیتا مگر رام سو (......)

لطیف جو کرتا نو اس بندسوں کہ جیوں بن میں راوں اچھے چھندسوں (......)

شہہ نے جیون کیسے شاہ عالی جناب نہ دارا کیا وونہ افرا سیاب

کسی بھی قدیم داستان کو ترتیب دیتے ہوئے تو اُس کا خلاصہ مقدمہ میں لکھ دے تا کہ داستان کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ پروفیسر گیان چند جین اپنی تصنیف ''تجربہ'' میں خلاصہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر داستان کی زبان فرسودہ ہے تو مقدمہ میں قصہ کا خلاصہ دینا
> بھی ضروری ہے تا کہ اسے پوری پڑھے بغیر اس سے متعارف
> ہو سکے''۔(۲۷)

مولوی عبدالحق نے مقدمے میں مثنوی کا خلاصہ تفصیل سے نہیں لکھا۔ بلکہ چند سطور میں مثنوی کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ مثلاً

> ''قصہ وہی قدیم طرز کا ہے یعنی محمد قلی قطب شاہ کے باپ
> سلطان ابراہیم قطب شاہ کے کوئی بیٹا نہ ہوتا تھا۔ آخر بیٹا ہوا۔ بڑی

خوشیاں منائی گئیں، داد و دہش کی گئی۔ بڑے ہوئے۔ ایک روز خواب میں ایک نازنین کو دیکھا۔ اس پر عاشق ہوگئے۔ اب جو آنکھ کھلی تو نظروں میں وہی سماں تھا۔ روز بروز حالت خراب ہونے لگی۔ بہت کچھ سمجھایا، کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر اپنے ایک مشیر مصور عطارد کو ساتھ لے کر پورے سامان کے ساتھ اُس نازنین کی تلاش میں نکلے۔ رستے میں بڑی بڑی مصیبتوں اور آفتوں کا سامنا ہوا۔ غرض اس ہفتخواں کو طے کر کے بنگالہ پہنچے جہاں کی وہ رہنے والی تھی۔ دونوں میں محبت ہو جاتی ہے۔ شاہزادے صاحب اُسے لے کر گولکنڈہ آتے ہیں جہاں بڑی دھوم دھام سے شادی ہوتی ہے''۔(۲۸)

مولوی عبدالحق نے بس اتنا ہی مثنوی ''قطب مشتری'' کا خلاصہ لکھا ہے جبکہ خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

بادشاہ کا نام ابراہیم قطب شاہ تھا۔ اُس کو کوئی اولاد نہ تھی۔ بادشاہ کو ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ اگر اُسے اولاد نہ ہوئی تو اُس کا نام لینے والا کوئی بھی نہیں رہے گا۔ مگر بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد ایک لڑکا تولد ہوا۔ اُس کا نام قلی قطب شاہ رکھا گیا۔ رواج کے مطابق گھر پر تعلیم دی گئی۔ شہزادہ اس قدر ذہین تھا کہ صرف بیس روز میں عالم، شاعر اور خوش نویس بن گیا۔

شہزادہ جوان ہوا اور شباب کا یہ عالم تھا کہ ایک ہاتھ سے مست ہاتھی کو پچھاڑ دیتا اور درخت کو زمین سے اُکھاڑ پھینک دیتا اور بڑے بڑے شہ زور اُس سے گھبراتے تھے۔ ایک روز شہزادے نے مجلس طرب جس میں خوبصورت مہ لقا، خوش طبع عاقل اور فاصل سب ہی موجود تھے۔ مطربوں نے ساز چھیڑے اور شراب و کباب کا دور چلنے لگا۔ مستی کا ایسا حال ہوگیا کہ پانی اور شراب میں کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ شہزادے نے محفل میں ایسی بدحواسی دیکھی تو محفل کو برخاست کر دیا۔ اس عالم میں شہزادے کو نیند آ گئی، خواب میں دیکھا کہ ایک خوبصورت جنگل ہے۔ جہاں ایک باغ اور پانی کا حوض جن کے کنارے خوبصورت پریاں جیسی عورتیں موجود ہیں۔ اس باغ میں ایک محل ہے اور اسی محل میں ایک سندری سنگار کئے ہوئے نظر آئی۔ شہزادے کی نظر اس پر پڑی تو وہ دیوانہ ہوگیا اور جب آنکھ کھلی تو بے چین و بے قرار ہوگیا۔ اب شہزادے کے تصور کی دنیا میں صرف اور صرف وہی

سندری موجود تھی۔ اُس کی جدائی میں آہیں بھرنے لگا۔ جب اس کی خبر مطربوں اور ندیموں کو ہوئی تو وہ پریشان ہو گئے اور بادشاہ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ بادشاہ نے یہ خبر سنی تو پریشان ہو گیا اور سیدھے ملکہ کے پاس گیا تا کہ اُس سے مشورہ کر سکے۔ دونوں فکرمند ہو کر بیٹے کے پاس گئے اور شہزادے کو پریشانی کا حال پوچھا تو وہ خاموش رہا اور کچھ نہ کہا۔ ابراہیم قطب شاہ سمجھ گیا کہ ہونہ ہو یہ عشق کا ماجرا ہے اور بادشاہ نے ایک تدبیر نکالی اور ملک کی تمام خوبصورت حسیناؤں کو ایک جگہ جمع کیا اور بادشاہِ وقت نے ان تمام سندریاں کو کہا کہ جو کوئی سندری شہزادے کو لبھائے گی وہ بڑا مرتبہ پائے گی۔ شہزادے کو اُس محفل میں بھیجا گیا۔ تمام سندریاں ملکر شہزادے کو لبھانے لگی۔ مگر اُس نے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ بادشاہ نے بڑے پیار سے گلے لگا کر شہزادے سے پوچھا شہزادے نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ اِن سندریوں میں وہ موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد شہزادے نے مجبور ہو کر اپنے خواب کا سارا حال بیان کیا۔ اب بادشاہ بہت پریشان ہو گیا۔

اُس زمانے میں ایک نقاش تھا جس کا نام عطارد۔ وہ بہت عقلمند، عالم، عاقل اور اتنا ہی منکسر المزاج بھی تھا۔ اُس نے سیر و سیاحت میں مشرق سے لے کر مغرب تک کوئی جگہ نہ چھوڑی تھی۔ عطارد کی خبر جب شہزادے تک پہنچی تو اُس نے اُسے بلا بھیجا اور عزت و احترام کے ساتھ اپنے پاس والے خلوت پر بٹھایا۔ اور اپنے خواب کا سارا حال بیان کیا۔ عطارد سمجھ گیا اُس نے کہا وہ ملک بنگالہ پر حکومت کرتی ہے اور اُس کی ایک بہن جس کا نام زہرہ ہے جو بڑی خوش الحان ہے۔ عطارد نے مشتری کی تصویر شہزادے کو دکھائی شہزادے نے تصویر دیکھتے ہی پہچان لیا اور خوش ہو کر عطارد کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ شہزادے نے عطارد سے کہا۔ اُس سے ملنے کی کوئی تدبیر بتا۔ اگر تو مجھے اُس سے ملنے کی کوئی صورت دکھلائے گا تو جو تو مانگے گا تجھے دوں گا میں تجھے اپنا دوست بنانا چاہتا ہوں۔ تا کہ تو مشتری کی تلاش میں میرے ساتھ رہے گا۔ عطارد یہ بات سن کر بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ اس کام میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ راستے میں بہت سے جن، پریاں اور دیو بستے ہیں۔ خوفناک جنگل اور درندوں سے سامنا ہوگا تو ابھی نوجوان ہے ہم بوڑھوں کی بات مان اور اُس کو ملنے کا ارادہ چھوڑ دے۔ شہزادہ اُس سے کہنے لگا میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ عطارد نے شہزادے کی ہمت اور عزم کو دیکھا تو کہا تو سچا عاشق ہے اور خدا نے چاہا تو بہت جلد اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔ اب تو سفر کی تیاری کر اور بادشاہ سے اپنے منزلِ مقصود کو جانے کی اجازت مانگ لیں۔

شہزادہ ماں باپ سے سفر پر جانے کی اجازت مانگا اور اُنھوں نے بہ دل نخواستہ جانے کی اجازت دے دی۔ بادشاہ نے شہزادہ کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن شہزادے نے ماں سے بہت اصرار کیا تو بادشاہ نے غلام، لونڈیاں اور خزانے کے ساتھ ساز و سامان ہاتھیوں پر لاد دیا اور سو اونٹوں پر مزید خزانہ بھی دیا تا کہ راستے میں کسی بھی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ شہزادہ نے فوج، غلاموں اور عطارد کو ساتھ لے کر ملک بنگالہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ قافلہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک پہاڑ نظر آیا جہاں بہت تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ شہزادے نے عطارد سے پوچھا یہ کونسی جگہ ہے اور یہاں اتنا اندھیرا کیوں ہے۔ عطارد نے جواب دیا یہ بلندھ گڑھ ہے اور اس پہاڑ کا نام بلکٹ پہاڑ ہے جو دیوؤں اور سانپوں کا مسکن ہے۔ اس مقام کی اونچائی میں آسمان سے بھی اونچا اور زمین سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ شہزادہ غور سے اُس پہاڑ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُس کی نگاہیں ایک ٹیلے پر جا کر مرکوز ہوئی جہاں دو مشعلیں چمک رہی تھیں۔ اُس کا رنگ سفید اور سیاہ ہے۔ یکا یک اُس جگہ پر دھواں اور آگ کی چنگایاں اُٹھنے لگی۔ شہزادے نے عطارد سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک پتھر نہیں بلکہ اژدہے کا تن ہے۔ اور وہ مشعلیں دراصل اُس اژدہے کی آنکھیں ہیں جب اژدہا سانس لیتا ہے تو دھواں اور چنگاریاں نکلتی ہیں۔ تب عطارد نے شہزادے سے کہا ہمیں یہاں سے واپس جانا چاہیئے۔ کیوں کہ اس راستے سے کوئی بھی سلامت نہیں گیا۔ شہزادے نے جواب دیا کہ مردِ میدانِ جنگ میں قدم آگئے بڑھانے کے بعد پیچھے ہٹایا نہیں کرتے۔ اس کے بعد شہزادے نے اژدہے کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا اور تمام فوج خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ شہزادے نے اژدہے کے قریب جا کر اپنی تلوار سے مارا تو اژدہا سر سے پاؤں تک دو ٹکڑے ہو گیا۔ تمام لوگ شہزادے کی بہادری کی تعریف کرنے لگے اور نعرے بلند کئے۔ پھر شہزادہ آگے بڑھا تو اُسے ایک قلعہ نظر آیا۔ شہزادے نے عطارد سے پھر دریافت کیا کہ یہ کس کا قلعہ ہے۔ عطارد نے جواب دیا اس قلعہ پر ایک راکشش رہتا ہے اور یہاں انسان کا گذر نہیں۔ اس راکشش کے تین سر اور چار ہاتھ ہیں اور اُس کی آنکھیں دو کنوؤں کی طرح ہیں۔ عطارد نے کہا کہ وہ راکشش ایسی کالی بلا ہے کہ اگر اُسے شیطان بھی دیکھے تو ڈر کر بھاگ جائیں۔ اس کے جسم کے بالوں میں سانپ لپٹے ہوئے ہیں اور وہ صبح کے وقت نو ہاتھیوں کا ناشتہ کرتا ہے۔ خدا اس کا منہ کبھی نہ دکھلائے۔ وہ دجال سے بھی سو گنا بڑا ہے اور اُسے دجال بھی نہیں مار سکتا۔ ہم لوگ اس قلعہ کو پار کرے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کیوں کہ کوئی اور دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اے شہزادے اب بھی

وقت ہے چل واپس لوٹ چلے۔شہزادے نے عطارد پر ہنستے ہوئے کہاتم بہت ڈرپوک انسان ہوا تنا ڈرنا اچھا نہیں۔شہزادے نے اپنے فوج میں سے بارہ بھروسہ مند آدمیوں کو لے کر قلعے میں داخل ہو گیا۔ قلعے میں داخل ہونے کے بعد شہزادے کی نظر ایک آدمی پر پڑی۔اُس نے شہزادے سے کہاتم لوگ یہاں سے بھاگ جاؤں یہاں ایک راکشش رہتا ہے وہ بھی تمہیں پکڑ کر قید کردے گا۔

شہزادہ اُس کے قریب جا کر حال دریافت کیا۔اُس نے جواب دیا میں حلب کا ایک بادشاہ ہوں۔جس کا نام شاہ سرطان ہے اُس کے وزیر کا نام اسد خاں اور میں اسد خاں کا بیٹا ہو۔اور میرا نام مریخ خان ہے۔

مریخ خان نے شہزادے کو اپنا حال بتایا کہ ایک رات خواب میں، میں نے ایک شہزادی کو دیکھا اور اُس کے عشق میں دیوانہ ہو گیا۔ایک پردیسی میرا دوست جو ہر علم میں ماہر تھا میں نے اس سے اپنے خواب کا ذکر کیا اور اُس سے تعبیر پوچھی۔اُس نے بتلایا کہ بنگالہ میں دو شہزادیاں رہتی ہیں ایک کا نام مشتری اور دوسری کا زہرہ ہے اور میں زہرہ کا عاشق ہوا اور اس کی تلاش میں نکل پڑا۔جب اس مقام پر پہنچا تو راکشش کی نظر مجھ پر پڑی اور اُس نے مجھے گرفتار کرلیا۔میرے ساتھ جتنے بھی ساتھی تھے سب بھاگ گئے۔اے نوجوان تو بھی یہاں سے چلا جا کیوں کہ اب راکشش کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

شہزادے نے مریخ خاں کو جواب دیا۔ تیری اور میری حالت یکساں ہے کیوں کہ میں بھی عشق میں گرفتار ہوں۔دونوں باتیں کررہے تھے کہ اچانک راکشش کی نظر شہزادے پر پڑی۔راکشش نے شہزادے کو ڈراؤنی شکلیں بنا کر ڈرانا چاہا۔شہزادے نے فوراً آیۃ الکرسی پڑھی اور اُس کے منہ پر تھوک دیا جس سے راکشش قریب نہ آسکا۔اس کے بعد راکشش نے پتھر پھینکنے شروع کئے۔شہزادے نے فوراً کمان پر کلمہ پڑھا اور اُسے تیر سے مارا۔جیسے ہی تیر راکشش کو لگی وہ زمین پر سر کے بل گر پڑا اور پاؤں اوپر ہو گئے۔شہزادے نے راکشش کے قریب جا کر اپنی تلوار سے ایک ہاتھ مارا اور اس کا سر کاٹ کر بیس کوس دور پھینک دیا۔اطراف کی زمین خون کا سمندر بن گئی اور راکشش نے اپنا دم توڑ دیا۔اس کے بعد شہزادہ، مریخ خاں اور عطارد تینوں مل کر خوشی سے آگے بڑھنے لگے۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک مقام پر پہنچے۔ جہاں سے دو راستے جاتے تھے۔شہزادے نے عطارد سے دریافت کرنے پر اُس نے جواب دیا۔ یہ دونوں راستے بنگال کی طرف جاتے ہیں اور دونوں

راستوں پر پریاں رہتی ہیں۔ شہزادے نے عطارد کی بات سن کر داہنے طرف جانے کا ارادہ کیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک مقام پر پہنچے۔ جہاں چاروں طرف رنگ برنگے پھول، سرسبز درختوں کے سائے اور پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ شہزادہ یہاں پڑاؤ ڈالا تاکہ کچھ آرام کرسکے۔ عطارد نے شہزادے سے کہا یہ پریوں کی جگہ ہے اور یہاں پر ایک پری رہتی ہے جس کا نام مہتاب ہے۔

مہتاب پری کے پاس ایک لونڈی ہے جس کا نام سلکھن ہے۔ دونوں ایک دوسرے اس قدر قریب ہیں کہ مالک اور لونڈی کا فرق ہی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ سلکھن کی نظر جب شہزادے پر پڑی تو اس کے حسن و جمال سے اس قدر مسحور ہوگئی کہ بھاگ بھاگ مہتاب پری کے پاس پہنچی اور اُس نے مہتاب پری کو شہزادے کے حُسن و جمال کی اس قدر تعریف کی کہ وہ بھی شہزادے سے ملنے کے لئے بیقرار ہوگئی اور سلکھن کے ساتھ شہزادے کو دیکھنے کے لئے گئی۔ شہزادے کو دیکھتے ہی وہ بھی دیوانی ہوگئی۔ اور سلکھن سے کہا کہ کسی طرح شہزادے کو ہمارے پاس لے آؤ۔ سلکھن شہزادے کے پاس گئی اور اُسے مہتاب پری کا پیغام دیا۔ شہزادے نے عطارد سے مشورہ کرکے مہتاب پری کی دعوت قبول کرکے اُس کے پاس پہنچا۔ مہتاب پری نے اس کا استقبال کیا اور دونوں مل کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ آخر دونوں نے ایک دوسرے کو بھائی، بہن بنالیا۔ شہزادے نے مہتاب پری کو راکشش کو مارنے کا سارا حال سنایا۔ وہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ شہزادے نے مہتاب پری کو راکشش کا محل تحفے میں دیا۔ پھر عیش وعشرت کی محفل شروع ہوئی۔ شراب و کباب کا دور چلا۔ اس بے قراری کے عالم میں شہزادے کو مشتری کی یاد آئی۔ عطارد نے شہزادے سے کہا۔ اب تو یہاں آرام کر اور مجھے بنگال جانے کی اجازت دے تاکہ میں مشتری کو یہاں بلالاؤں یا پھر تجھے اُس کے پاس لے جاؤں۔ شہزادے نے عطارد کو جانے کی اجازت دی اور وہ بنگال پہنچ گیا اور اُس نے مشتری کے محل کو نیچے ہی مصوری کی دکان شروع کی۔ عطارد بنگال میں اس قدر مشہور ہوگیا کہ شہر میں جتنے مصور تھے سب اُس کے شاگرد ہوگئے اور عطارد کی شہرت اتنی ہوئی کہ اس کی خبر مشتری کی دائی مہروان تک پہنچ گئی۔ مشتری مہروان دائی کا بڑا ادب کرتی تھی۔ اُس نے مشتری سے کہا کہ ایک ماہر مصور آیا ہوا ہے جو اپنے فن میں بہت ماہر ہے۔ دائی کی زبان سے عطارد کی اتنی تعریف سن کر مشتری نے دائی سے کہا کہ ضرور تو اُسے جانتی ہے۔ مشتری کی یہ بات سن کر دائی ناراض ہوگئی اور ناراضگی کے انداز میں کہنے لگی کہ تجھے مجھ پر بروسہ نہیں۔ اگر تجھے مجھ پر اعتبار نہیں تو کسی اور سے معلوم کرلے کہ

صحیح کہہ رہی ہوں یا غلط۔ دائی کی بات سن کر مشتری نے کہا میں تو یوں ہی مذاق کر رہی تھی۔ مجھے تجھ پر پورا بھروسہ ہے۔ اگر میں تجھ پر اعتبار نہ کروں تو کس پر کروں۔ کیوں کہ تو میری ماں جیسی ہے۔ مشتری نے دائی سے بہت منت کی۔ آخر دائی رضا مند ہو کر عطارد کو بلا بھیجا۔ عطارد بڑے ادب و احترام کے ساتھ مشتری سے گفتگو کی اور محل کی آرائش کا کام شروع کیا۔ اس خوبصورتی سے محل کی آرائش کی اور مرکز میں قطب شاہ کی تصویر بنائی۔ مہروان دائی سے عطارد نے کہا کہ محل کی آرائش کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ اب مشتری اس کو دیکھ سکتی ہے۔ مشتری جب دیواروں کا جائزہ لے رہی تھی تو اچانک اُس کی نظر قطب شاہ کی تصویر پر پڑی۔ مشتری نے جوں ہی قطب شاہ کی تصویر دیکھی تو بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی اور بہت دیر تک بے ہوش رہی اور قطب شاہ کے عشق میں آہیں بھرنے لگی۔ مہروان دائی اس کی حالت سے بہت پریشان ہوئی اور مشتری کو اس کی وجہ پوچھی۔ دائی کے بہت اصرار کے بعد مشتری نے قطب شاہ کی تصویر دکھائی۔ دائی نے بہت غور سے قطب شاہ کی تصویر دیکھی تو وہ اپنے ہوش کھو بیٹھی اور کہنے لگی اگر تو اس کی دیوانی ہو گئی تو اس میں تیرا کیا قصور۔ آخر مشتری نے عطارد کو بلا بھیجا اور اس کی مصوری کی بہت تعریفیں بھی کرنے لگی اور موقع پا کر تصویر کے بارے میں پوچھنے لگی۔ عطارد نے موقع کو غنیمت سمجھ کر قطب شاہ کے بارے میں بتلایا۔ مگر قطب شاہ بھی مشتری کے عشق میں دیوانہ ہونے کا حال نہیں بنایا۔ مشتری نے قطب شاہ سے ملنے کی درخواست کی۔ عطارد نے فوراً قطب شاہ ایک خط بھیجا اور مشتری کے عشق کے بارے میں بتایا۔ خط پڑھ کر قطب شاہ بہت خوش ہوا اور مہتاب پری سے جانے اجازت مانگ لی۔ مہتاب پری نے قطب شاہ کو رخصت کرتے وقت ایک انگوٹھی اور ایک گھوڑا تحفے میں دیا۔ اب قطب شاہ پوری شان و شوکت کے ساتھ بنگال کی سرزمین پر پہنچا۔ مشتری نے قطب شاہ کا بہت زور و شور سے استقبال کیا اور دونوں عشق میں اس قدر محو ہو گئے کہ انھیں کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ عطارد نے قطب شاہ کے قریب جا کر کہا کہ جب تک شرعی طور پر نکاح نہ ہو جائے یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ شہزادہ اور مشتری دونوں سنبھل گئے۔ مریخ خاں نے موقع پا کر اپنی محبت کی بات یاد دلائی۔ شہزادے اور مشتری نے زہرہ اور مریخ خاں کا نکاح کر دیا اور مریخ خاں کو بنگال کی حکومت سونپ کر مشتری اور قطب شاہ دکن کے لئے روانہ ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد دکن پہنچ گئے۔ جہاں قطب شاہ کے ماں باپ نے اِن دونوں کا استقبال کیا اور تمام رسم و رواج سے دونوں کی شادی ہو گئی اور عطارد کو اُس کے صلے کا انعام دیا گیا۔ ابراہیم قطب شاہ چونکہ بوڑھا ہو چکا تھا اس نے قطب شاہ کو تخت و تاج

سونپ دیا اور خود گوشہ نشین ہو گیا۔

اس کے بعد آخری باب میں بردن محمد قلی قطب شاہ بکارت مشتری ہے۔ جس میں عریاں نگاری کو پیش کیا گیا ہے۔ اور اسی پر داستان کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد نو اشعار دعا پر مبنی ہے۔ اور یہ دعا قطب شاہ کی طرف سے ہے۔ اس کا عنوان ''دعا خواستن محمد قطب شاہ'' ہے اور آخر میں آٹھ اشعار جن میں تعلیٰ آمیز اشعار اور مثنوی کی تعریف کی گئی ہے۔

حوالے

1- ڈاکٹر م ن ۔سعید ''حیات وجہی'' ص 27، 1990ء

2- ایضاً ص 27

3- سید محی الدین قادری زور'' تذکرۂ مخطوطات جلد سوم'' ص 318، 1984ء

4- نصیر الدین ہاشمی ''یوروپ میں دکھنی مخطوطات'' ص 27، 1932ء

5- افسر صدیقی امروہوی ''مخطوطات انجمن ترقی اُردو جلد پنجم'' ص 201، 1984ء

6- ڈاکٹر گیان چند جین'' تجزیے'' ص 78، 1973ء

7- ملا وجہی ''قطب مشتری'' مرتب مولوی عبدالحق ص 6، 1939ء

8- ایضاً ص 17-16

9- سید محی الدین قادری زور'' تذکرہ مخطوطات جلد سوم'' ص 18، 1984ء

10- نصیر الدین ہاشمی ''یوروپ میں دکھنی مخطوطات'' ص 27، 1932ء

11- ملا وجہی ''قطب مشتری'' مرتب مولوی عبدالحق ،ص 16

12- سید محی الدین قادری زور، تذکرہ مخطوطات، جلد سوم، ص 319، 1984ء

13- ملا وجہی ''قطب مشتری'' مرتب مولوی عبدالحق ص 3، 1939ء

14- ایضاً ص 45

15- ایضاً ص 46

16- ایضاً ص 4

17- ایضاً ص 1

18- ایضاً ص 2

19- ایضاً ص 10

20- ایضاً ص 8-7

21- ایضاً ص8

22- ایضاً ص7

23- ایضاً ص7

24- ایضاً ص9

25- ایضاً ص10

26- ایضاً10

27- پروفیسر گیان چندجین ''تجزیہ'' ......

28- ملاوجہی۔قطب مشتری۔مرتب مولوی عبدالحق ص2-1، 1939ء

باب دوّم

مولوی عبدالحق کی مرتبہ دکنی مثنویاں

(ج) ''گلشن عشق''

سن عیسوی 1490 بمطابق 895 ہجری میں جب بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تو دکن میں پانچ خودمختار حکومتیں بنیں۔ ان میں نظام شاہی، برید شاہی، عماد شاہی، قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتیں شامل ہیں۔ 1490ء م 895ھ میں یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں اپنی خودمختار حکومت کا اعلان کردیا۔ یوسف عادل شاہ، آغا مراد کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، جو محمود گاواں کے ہاتھوں فروخت ہوا۔ یوسف عادل شاہ نے پچیس سال حکومت کرنے کے بعد 1511ء م 915ھ میں انتقال کیا۔(1) یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا جانشین اسمٰعیل عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ اسمٰعیل عادل شاہ فارسی کا کہنہ مشق شاعر اور وفائی تخلص کرتا تھا۔ اسمٰعیل کے بعد ابراہیم عادل شاہ اول 1537ء م 941ھ میں تخت پر بیٹھا۔ ابراہیم عادل شاہ ایک حوصلہ منداور طاقتور حکمران تھا۔ وہ علماء اور شاعروں کی بڑی قدردانی کرتا تھا۔ اس کا سب سے اہم کارنامہ فارسی زبان کے بجائے ''ہندی زبان'' کو دفتری زبان قرار دینا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے 1556ء م 965ھ میں انتقال کیا۔

ابراہیم عادل شاہ اول کی وفات کے بعد علی عادل شاہ اول تخت نشین ہوا۔ علی عادل شاہ ایک امن پسند اور صلح کا قائل حکمران تھا۔ اس کے عہد حکومت میں عرب، ایران، عراق اور دوسرے مقامات سے علماء اور شعراء بیجاپور کو آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ان علماء نے درس و تدریس کو اپنایا۔ خود بادشاہ کو بھی مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اور اس کے محل میں ایک عمدہ کتب خانہ بھی موجود تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں طرزِ تعمیر پر بھی بڑا زور دیا گیا تھا۔ اس نے حضرت علیؓ کے نام سے ایک مسجد تعمیر کروائی اور اُس کا نام ''مسجد غالب'' رکھا۔ اور اسی کے عہد میں جامع مسجد کی بھی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ مسجد بیجاپور شہر کے مشرقی حصے میں آج بھی واقع ہے۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں اپنے نام کے سکے بھی جاری کروائے تھے۔ علی عادل شاہ اول نے 1580ء م 988ھ میں رحلت کی۔(2)

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے نو سال کی عمر میں اپنے چچا علی عادل شاہ اول کے انتقال پر 1580ء م

988ھ میں تخت نشین ہوا۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تعلیم وتربیت اس کی چاچی (جو احمد نگر کی مشہور شہزادی اور علی عادل شاہ اول کی ملکہ) چاند سلطانہ نے کی تھی۔ابراہیم عادل شاہ ثانی فنون لطیفہ کا شیدائی تھا۔چنانچہ موسیقی اور شاعری میں اُس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔''کتاب نورس'' اُس کی یادگار ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے بعد محمد عادل شاہ 1037ھ میں سربراہ سلطنت ہوا۔اس نے اپنے عہد میں مغل سلطنت سے دوستانہ تعلقات قائم کئے تھے۔گول گنبد یا بولی گنبد محمد عادل شاہ کی ہی تعمیر ہے۔اس کے عہد کے طرزِ تعمیر کو Indo Persio Ottoman Architecture کہتے ہیں۔اس نے طرزِ تعمیر کے علاوہ تصنیف وتالیف پر بھی زور دیا تھا۔حکیم آتشی نے ''خمسہ نظامی'' کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھیں اور ظہوری کے فرزند ملا ظہور نے ''محمد نامہ'' مرتب کیا۔محمد عادل شاہ کے درباری شاعر صنعتی نے ''قصہ بے نظیر'' (1055ھ) لکھا۔محمد عادل نے 1656ء م 1068ھ میں رحلت فرمائی۔

محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔وہ خود بھی ایک شاعر تھا۔اور اہل علم اور شعراء کی صحبت کو پسند کرتا تھا۔شاہ کمال، علامہ فتح اللہ شیرازی، قاضی کریم اللہ، ارسطو زماں ملا مصطفٰے خاں کیانی، شاہ ابو المعانی، احمد قاضی، مرزا مقیم، حکیم آتشی، عبدالقادر، دولت شاہ جیسے ادیب وشاعر اُس کے عہد میں موجود تھے۔علی عادل شاہ نے اپنے دور میں مخصوص قسم کے سکے بھی جاری کئے۔ان سکوں پر ایک طرف ''علی عادل شاہ'' اور دوسری طرف ''غلام حیدر صفدر'' کندہ کیا گیا تھا۔اس کے دور کی طرز تعمیر میں حسینی محل (1656ء م 1067ھ)، علی داد محل (1658ء م 1069ھ)، بادشاہ محل (1670ء م 1081ھ)، گگن محل اور آنند محل بھی شامل ہیں۔علی عادل شاہ کا انتقال 1083ھ میں ہوا۔

علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا۔تخت نشینی کے وقت سکندر عادل شاہ کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے سلطنت کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا جس میں خواص خاں کو دارالخلافہ اور اُس کے آس پاس کے علاقے دیئے گئے۔عبدالمجید کو شمال مشرقی علاقے بشمول قلعہ شاہ درک اور گلبرگہ، عبدالکریم بہلول خاں کو مغرب یعنی مرج اور قلعہ پنہالہ اور مظفر خاں کو جنوب کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔جب عادل شاہی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو سکندر عادل شاہ نے 14 سال کی عمر میں حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔اس کے دورِ حکومت میں شیواجی اور مغلوں کے پے در پے حملے ہوئے اور بادشاہ کی

ناتجربہ کاری اورامراء کی خودغرضی نے بیجاپور کی سلطنت کی بنیادیں ہلاڈالی تھیں۔

یکم اپریل 1685ءم 1096ھ کوشہزادہ اعظم نے بیجاپور کا محاصرہ کیا تو عادل شاہی فوج نے بڑی بہادری سے شہزادہ اعظم کا مقابلہ کیا۔اس کے بعد خوداورنگ زیب نے 3 جولائی 1686ءم 1097ھ کورسول پور جو بیجاپور کے مغرب میں واقع ہے، وہاں محاصرہ کو سخت کردیا۔ یہ محاصرہ 1685ءم 1096ھ سے 1686ءم 1097ھ تک برقراررہا(3)۔آخرکار 13 اپریل 1686ءم 1097ھ کوسکندر عادل شاہ نے بادشاہ کی حیثیت سے خزانے کی کنجیاں اورنگ زیب کوسونپ دیں۔

سکندر عادل شاہ کو پہلے قلعہ دولت آباد میں رکھا گیا۔ پھراس کے بعد اورنگ زیب کے ہمراہ قیدی کی حیثیت سے شمال کی جانب روانہ کیا گیا۔اس طرح 1686ءم 1097ھ میں عادل شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

اس کے تین سال بعد یعنی 3 اپریل 1700ءکو عادل شاہی سلطنت کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ کا انتقال ہوگیا۔

بیجاپور کی مشہور مثنوی گلشن عشق ہے جسے علی عادل شاہ ثانی شاہی کے ملک الشعراء نصرتی نے 1068ھم 1669ءمیں لکھی ہے۔

شیخ نصرت نام اوراپنے نام کی مناسبت سے نصرتیؔ تخلص اختیار کرلیا تھا۔(4) لیکن عبدالجبار خاں ملکاپوری نے اپنی تصنیف ''محبوب ذوالمنن تذکرہ شعراء دکن'' (ص 1090) اورنصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف ''یوروپ میں دکنی مخطوطات (ص 197) اور دوسری تصنیف ''دکن میں اُردو(ص 87) میں شاعر کا نام محمد نصرت تحریر کیا ہے۔جبکہ مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف ''نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور کے حالات وکلام پر تبصرہ''، میں نصرتی کے بھائی شیخ منصور کے حوالے سے نصرتی کے بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں:۔

> ''آپ کے دو برادر مولانا شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء اور شیخ عبدالرحمٰن سپاہی تھے۔ یہ ہرسہ برادرانِ حقیقی ہیں۔ ہرایک صاحب ایک ایک فن میں کمال رکھتے تھے۔ شیخ منصور علم دعوت میں، شیخ عبدالرحمٰن سپاہ گری میں اور شیخ ملا نصرتی شاعری میں۔مولانا شیخ منصور

اور شیخ عبدالرحمٰن دونوں کو اولادِ صلبی نہیں ہے۔ مولانا شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء کو آل ہے اولا دنہیں اوران کی آل سے پانچ چادر والے، گھڑیاں والے، منور والے، ہاشیم پیر والے مقبل والے، گول سنگی والے، نگینہ باغ والے، ہم ساگر والے موجود ہیں۔()

شمس اللہ قادری نے تصنیف ''اردوئے قدیم'' میں نصرتی اور اُس کے آباواجداد کو بیجاپور کے باشندے تحریر کیا ہے۔ اور لچھمی نارائن شفیق نے ''تذکرہ چمنستان الشعراء'' میں نصرتی کو حاکم کرناٹک لکھا ہے۔ نصرتی کے والد عادل شاہی سلطنت کے سلحدار تھے۔ مثنوی ''گلشن عشق'' میں نصرتی اپنے والد کے پیشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

که تھا مجھ پدر سو شجاعت مآب　　قدیم یک سلحدار جمع رکاب
و وشہ کام پر زندگانی منے　　کمربستہ تھا جانفشانی منے

(ص30)

جہاں نصرتی نے مثنوی ''گلشن عشق'' میں اپنے والد کے پیشہ کا ذکر کیا ہے، وہیں اپنی تعلیم وتربیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ادک تھیچ لگ مجھ میں نھنوادگی　　میرے حق میں اندیش اُستادگی
نظر دھر کے مجھ تربیت میں سدا　　رکھیا نیں کدھی مجھ استے جدا
سکھ مجتی جانے کون نسدن منے　　پھرے لئی بزرگاں کی مجلس منے
معلم جو میرے جتنے خاص تھے　　دھرے ھار او مجھ سوں اخلاص تھے
کچھ یک میں سنبھالیا جب اپنا شعور　　گیا کر کتاباں پر اکثر عبور
تجھاد ھر یک طرح کا پھول بن　　دکھیا دل میں تس باغبانی کا فن
دیکھیا کہوں جو ہر بزم میں کر خیال　　حریفاں گئے ہیں سو سرمست حال
یہی مجھ منے عشق ھور شوق تھا　　اوسی کے نظاریاں میں نت ذوق تھا

(ص30)

نصرتی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی اس سے تمام تذکرے خاموش ہیں۔صرف تحقیق سے اتنا معلوم ہوا ھیکہ اُس نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا اور بڑی عمر پائی۔گارسادتاسی نے تصنیف ''تاریخ زبان وادب ہندوستانی و ہندی کی جلد دوم'' (ص 87-485)، جے این چودھری نے ''دی مغل ایمپائر'' (ص 629)، اور سری رام شرما نے ''انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا'' کے حوالے سے تصنیف ''دکنی ہندی کا ساہتیہ'' (ص 221) میں نصرتی کو برہمن ثابت کیا ہے۔مگر مثنوی ''گلشن عشق'' کی اندرونی شہادت سے نصرتی اور اُس کے آباواجداد برہمن یا نومسلم ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، بلکہ اُس نے مثنوی کی ابتداء حمد سے کی ہے۔اس کے بعد مناجات، نعت، صفت معراج، حضرت علیؑ کا ذکر اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے اپنی ولولہ عقیدت کا ذکر کیا ہے۔اشعار ملاحظہ ہو۔

زباں دھوکے پھل نبر سوں مکھ میں لاؤں — بو سید محمد حسینی کا ناؤں
جتے عاشقاں میں اچھے سرفراز — جتے جگ کا مخدوم بندہ نواز
او شہباز جس عرش اچھے آشیاں — جسے صید گہ وسعت لامکاں
صدی آٹھویں میں تمہیں اے ومی — کیا تازہ جنت میں جان علی
کہے ہیں نبی انبیاں کی سلف — ادک ہے آپس عالمان کا شرف
نہ کچھ ظاہری فاضلاں کی ہے بات — کہ ہے باطنی عالمان کا صفات
فضیلت میں تجھ آج ہے بے خطا — کہ علم لدنی تجھے ہے عطا (ص20)
طریقت میں تجھ طالبان رت رشید — حقیقت میں پیراں ہیں تیرے مرید
زہے نونچھ مخدوم بندہ نواز — تیرا بندہ دو جگ میں نت سرفراز
قیامت کا جب روز سوئے گا کٹھن — یکس یکتی نبھائینگے بیارے اودن
دیوے آسرا کوئی نہ اُس وقت آہ — علم تجھ سوں عالم کی تب ہوئے پناہ
بحمد للہ کرسی بہ کرسی مری — چلی آئی ہے بندگی میں تیری
جو ہوں میں جو بندہ اسیر ہوا — کہ آیا ہوں تجھ بندگی میں نوا
نپٹ گرچہ خدمت میں ہوں بے سج — ولیکن وفا کا چہ ہے مجھ میں لج

توں بندہ نوازی سوں کر سرفراز　　　کہ دو جگ کی حاجت تی ہوں بے نیاز
زھے مالک الملک کی بارگاہ　　　بلند تر ہے ہوں میں تو ہوں بے نیاز
(ص21)

بحمد للہ کرسی بہ کرسی مرے
چلے آئے ہیں بندگی میں ترے

مولوی عبدالحق اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں کرسی سے مراد پیڑھی یا پشت ہے یعنی میں پشت در پشت یا نسلاً بعد نسلاً تیری بندگی میں ہوں۔اس سے ظاہر ہے کہ اس کے باپ دادا مسلمان تھے۔(8)

مثنوی ''گلشن عشق'' کی اندرونی شہادت اور مولوی عبدالحق کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ھیکہ نصرتی سنی عقائد کا حامل تھا۔ جہاں اس نے مثنوی میں حمد، نعت، مناجات کا ذکر کیا ہے وہیں خلفائے راشدین کی منقبت بھی بڑے پر جوش انداز میں کہی ہے جس سے اس کے مذہبی تصورات کا اندازہ ہوتا ہے۔

نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ(1037ھ تا1067ھ)،علی عادل شاہ ثانی(1067ھ تا 1083ھ)اور سکندر عادل شاہ(1083ھ تا1094ھ) کا زمانہ دیکھا اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ملک الشعراء کے عہدے پر فائز ہوا۔نصرتی کے ملک الشعراء کے عہدے کے سلسلے میں کئی اختلافات ملتے ہیں جن کی پوری تفصیل دیتے ہوئے سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

نصرتی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ملک الشعراء کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوا تھا۔گلشن گفتار میں حمید اورنگ آبادی لکھتے ہیں کہ ''مدمالت'' کو ہندوی میں ''بہ نزاکت تمام'' نظم کرنے کی وجہ سے ''از بادشاہی خطاب ملک الشعراء یافت'' فتون نے ''ریاضِ حسنیٰ'' میں لکھا ہے کہ نصرتی کو ملک الشعراء کا خطاب عالم گیر نے عطا کیا تھا۔لیکن محمد ابراہیم زبیری کی قدیم تاریخ بساتین السلاطین سے اس کی تردید

ہوتی ہے۔ وہ علی عادہ شاہ کے عہد کے ''ہندی شعرا'' کا ذکر کرتے ہوئے اُسے ''ملک الشعراء'' تحریر کرتا ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری کا بیان ہے کہ ملک الشعراء کا خطاب علی عادل شاہ نے ''علی نامہ'' لکھنے کے صلے میں عطا کیا تھا۔ جب 1067ھ میں محمد عادل کا انتقال ہوگیا تو علی عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ اپنے زمانہ جوانی کے رفیق وہم نشین کو اس نے فراموش نہیں کیا۔ اُسے دربار میں بلایا۔ اس کی عزت وتکریم کی اور درباری شاعر بنا کر ایسی تنخواہ مقرر کردی کہ وہ غم روزگار سے ''بے نیاز'' ہوگیا۔(9)

نصرتی کی تمام عمر شعروشاعری میں گذری۔ اُس نے ہر عہد میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ اُس کی ادبی زندگی کا آغاز محمد عادل شاہ کے دورِ حکومت میں ہوا۔ سید محمد اپنی مرتبہ مثنوی ''گلشن عشق'' کے مقدمے میں نصرتی کی ادبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''نصرتی کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی کسی طرح اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ البتہ اس کی تصانیف سے یہ بات ثابت ہوتی ھیکہ اس کی نشوونما محمد عادل شاہ کے عہد (1037ھ تا 1067ھ م 1656ء تا 1668ء) میں ہوئی ۔ اس کی پہلی مثنوی 1068ھ م 1669ء میں یعنی محمد عادل شاہ کے انتقال کے ایک سال بعد اور اس کے مربی شہزادہ علی عادل شاہ ثانی کے ابتدائی عہد حکومت میں لکھی گئی۔ دوسری مثنوی ''علی نامہ'' اسی بادشاہ کے عہد میں 1076ھ میں تصنیف ہوئی۔ اُس کی تیسری اور آخری مثنوی جس کا نام تاریخ اسکندری ہے 1083ھ میں تصنیف ہوئی، جس سال اس کے مربی کی وفات اور اُس کے فرزند سکندر عادل شاہ کی مسند نشینی ہوئی ہے۔ اس طرح نصرتی نے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔(10)

نصرتی کی پہلی مثنوی ''گلشن عشق'' کو مولوی عبدالحق نے 1952ء میں مرتب کر کے اپنے مفید مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کراچی سے شائع کیا۔ مثنوی ''گلشن عشق'' جملہ 261 صفحات پر مشتمل ہے۔ 12 صفحات پر مقدمہ، 223 صفحات میں متن اور 26 صفحات پر فرہنگ دی گئی ہے۔ اس کے بعد مثنوی ''گلشن عشق'' کو سید محمد نے اپنے مقدمے کے ساتھ حیدرآباد (   ) سے شائع کیا۔ سید محمد کی مرتبہ تصنیف ''گلشن عشق'' جملہ 383 صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتداء کے 6 صفحات پر سید محمد اعظم کا پیش لفظ موجود ہے۔ اس کے بعد 36 صفحات پر مقدمہ، اور 307 صفحات میں متن موجود ہے۔ اور آخری 24 صفحات پر مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی موجود ہے۔

نصرتی کی دوسری مثنوی ''علی نامہ'' کو عبدالمجید صدیقی نے 1959ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ سالار جنگ دکنی پبلشنگ کمیٹی کی سرپرستی میں شائع کیا۔ عبدالمجید صدیقی کی مرتبہ تصنیف جملہ 458 صفحات پر موجود ہے۔ ابتدائی چار صفحات میں مہدی نواز جنگ کا پیش لفظ ہے۔ 24 صفحات میں مقدمہ اور 428 صفحات میں متن موجود ہے۔ عبدالمجید صدیقی نے مشکل الفاظ کی فرہنگ نہیں دی ہے جبکہ ترتیب متن میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔

نصرتی نے مثنویوں کے علاوہ چند قصائد، غزلیات اور رباعیات بھی لکھی ہیں۔ وہ دکن کا سب سے بلند پایہ قصیدہ نگار گذرا ہے۔ نصرتی قصیدہ نگاری کے فنی خدوخال، زور بیان، تخیل کی پرواز، مناظر قدرت اور فنی لوازمات سے بخوبی واقف تھا۔ نصرتی اگرچہ درباری شاعر تھا لیکن اس کے قصائد میں حکمرانِ وقت کی حمد و ثنا کے علاوہ جنگ کے واقعات اور مظاہر قدرت کا بیان بھی بڑے پُرزور انداز میں ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق نصرتی کے قصیدوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''علی نامہ'' میں کل سات قصیدے ہیں اور یہ سب بڑے بڑے ہیں جن میں سے ایک 220 شعر کا اور ایک 158 شعر کا، ایک 150 شعر کا اور ایک 218 اشعار کا ہے۔ سب سے پہلا قصیدہ قلعہ پنالا کی فتح پر لکھا ہے۔ اگر ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' کے عنوانات کو یکجا کر لیا جائے تو دو قصیدے ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس کا ایک ہجویہ قصیدہ

بھی ہے۔ایک دوسرا علی عادل شاہ کی مدح میں اور ایک اپنے گھوڑے
کی مذمت میں ہے۔غرض اس طرح کل بارہ قصیدے ہوئے، جو اَب
تک دستیاب ہوئے ہیں۔(11)

مولوی عبدالحق نے نصرتی کے بارہ قصیدوں کے علاوہ ایک اور قصیدے کا ذکر کیا ہے جو خاصا طویل ہے۔انھوں نے اس قصیدے کو قصیدے کی ایک خاص قسم ''چرخیات'' سے موسوم کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

''ایک طولانی قصیدہ جس میں تخمیناً (134) اشعار ہیں، معراجِ
نبویؐ کے بیان میں ہے۔اسے نصرتی کے ''چرخیات'' میں شریک کیا گیا
ہے۔قدیم دکنی میں قصیدے کی ایک قسم ''چرخیات'' سے موسوم کی گئی
ہے۔ یہ وہ قصائد ہیں جن کی تشبیب فلکیات سے متعلق ہوتی ہے۔
چنانچہ اس قسم کے قصائد سلطان قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور
دوسرے شاعروں نے بھی لکھے ہیں۔(12)

مولوی عبدالحق نے نصرتی کے قصیدوں کی تعداد بارہ بتائی ہے۔انھوں نے چرخیات کو قصیدے کی ایک خاص قسم شمار کیا ہے جبکہ جمیل جالبی، نصرتی کے قصیدوں کی تعداد تیرہ بتاتے ہیں۔انھوں نے چرخیات کو بھی قصیدے میں ہی شامل کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''نصرتی اُردو کا پہلا بڑا قصیدہ نگار بن کر سامنے آتا ہے۔''علی
نامہ'' میں نصرتی کے سات قصیدے ملتے ہیں۔''گلشن عشق'' اور ''علی
نامہ'' کے عنوانات ملا کر دو اور قصیدے بن جاتے ہیں۔اگر ''ہجو سخنور''،
''مدح علی عادل شاہ''، قصیدہ ''گھوڑا مانگنے کی درخواست'' اور قصیدہ
''چرخیہ'' کو شامل کرلیا جائے تو اس طرح نصرتی کے کل قصائد کی تعداد
تیرہ ہو جاتی ہے اور یہ اتنی بڑی تعداد اور ان کا معیار اتنا بلند ہے کہ اُردو
کے بلند پایہ قصیدہ نگاروں میں نصرتی کا شمار کیا جانا چاہیے۔(13)

نصرتی کی سن وفات میں کئی اختلافات ملتے ہیں۔مولوی عبدالجبار ملکاپوری نے ''تذکرہ شعراء دکن''

(1912ء) میں نصرتی کا سن وفات (1095ھ) تحریر کیا ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے تصنیف ''اُردوئے قدیم'' (1927ء) میں (1095ھ، ص 87)، گوپی چند نارنگ نے تصنیف ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں'' میں (1095ھ، ص99) اور سید محی الدین قادری زور نے تصنیف ''اُردو شہ پارے'' میں نصرتی کی سن وفات (1081ھ، ص60) لکھی ہے جبکہ مولوی عبدالحق نے اپنی مرتبہ مثنوی ''گلشن عشق'' کے مقدمے میں نصرتی کے سن وفات پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔ مگر اپنی دوسری تصنیف ''نصرتی'' (ملک الشعرائے بیجاپور کے حالات وکلام پر تبصرہ) میں عبدالجبار ملکاپوری کے اس بیان پر صرف شک کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالجبار مرحوم نے ''تذکرہ شعرائے دکن'' میں ان کا سن وفات 1095ھ لکھا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ اطلاع انھیں کہاں سے حاصل ہوئی۔ اگر یہ سن وفات صحیح ہے تو فتوت کا بیان صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ عالمگیر نے بیجاپور کو سنہ 1097ھ میں فتح کیا تھا۔'' (14)

لیکن سید محمد نے اپنے مضمون ''نصرتی کا سن وفات'' رسالہ ''سب رس'' جنوری 1940ء میں نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں موجود ایک قلمی نسخے کی مدد سے یہ ثابت کیا کہ نصرتی کی وفات 1085ھ میں ہوئی۔ لکھتے ہیں:

''نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں ''گلشن عشق'' کے ایک قلمی نسخے پر نصرتی کی وفات کے متعلق یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

ضرب شمشیر سوں یہ دنیا چھوڑ — جاکے جنت کے گھر میں خوش ہورہے
سالِ تاریخ آملائک نے — یوں کہے شہیدا ہے

''نصرتی شہیدا ہے'' سے 1085ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس نسخے کا سن کتابت 1093ھ ہے اور یہ بہت ہی قدیم نسخہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ نصرتی کی آخری مثنوی 1083ھ کی لکھی ہوئی ہے اور فتوت کی روایت بھی غور طلب معلوم ہوتی ہے۔ نصرتی کے متفرق کلام مثلاً رباعیات وغیرہ سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ

> انقراض دولت بیجاپور کے بعد زندہ رہا ہوگا۔ اس لئے بحالات موجود
> اس قطعے کی بنا پر اس کا سن وفات 1085ھ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس
> قطعے سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ نصرتی پر کسی نے تلوار سے حملہ
> کیا تھا اور وہ اس صدمے سے شہید ہوا۔(15)

''گلشن عشق'' نصرتی کی ایک اہم مثنوی ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں منوہر اور مدمالتی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کے مرکزی کردار منوہر اور مدمالتی ہیں۔ قصے کو آگے بڑھانے کے لئے چنپا قلی اور چندرسین کا قصہ ضمنی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کہانی یا پلاٹ کی تکمیل کی غرض سے دیو، جن، پریوں جیسے کرداروں کو لایا گیا ہے۔ قصہ خالص ہندوستانی طرز کا ہے۔ راجا جس کو اولاد نہ ہونا، دعاؤں اور منتوں سے اولاد کا ہونا، پھر شہزادہ جوان ہونا، اُس پر کٹھن وقت کا آنا، کسی شہزادی کے عشق میں مبتلا ہونا، اپنی معشوقہ کی تلاش میں کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا، اور آخرکار دونوں کی شادی ہونا۔ مثنوی کے سنہ تصنیف میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے کہ نصرتی نے خود مثنوی کے آخر میں سنہ تصنیف لکھ دیا ہے۔

کہیا اس کی تاریخ یو ہجری

مبارک یو ہے ہدیہ نصرتی

اس مصرع سے 1068ھ نکلتا ہے۔

مثنوی کی ابتداء حسب معمول حمد و نعت اور مناجات سے ہوتی ہے۔ کچھ اشعار حضرت خواجہ بندہ نواز کی تعریف میں ہیں۔ پھر علی عادل شاہ کی مدح ہے۔ چند اشعار میں نصرتی نے اپنے حالات زندگی کو پیش کیا ہے۔ پھر عقل کی تعریف کی ہے۔ اور قصہ شروع ہو جاتا ہے۔

مثنوی کے تمام عنوانات اشعار میں لکھے گئے ہیں۔ ہر شعر میں پورے باب کا خلاصہ آجاتا ہے۔ اگر ان سارے عنوانات کے اشعار کو ملا دیا جائے تو قصیدہ بن جاتا ہے۔ نصرتی کے بعد کئی شاعروں نے اس روش کو اپنایا ہے۔ نصرتی نے مثنوی میں مناظر قدرت کی بھی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ سردی اور گرمی کی کیفیت، موسم باراں کا حال، باغوں میں چرندوں، پرندوں کی چہچہاہٹ، اس کے علاوہ پھولوں اور پھلوں کا بیان، چاندنی رات کا سماں، کشتی کی روانی کا حال، کھانوں اور پکوانوں کی تفصیل، شادی بیاہ کی تفصیل وغیرہ کو نصرتی نے بڑے ہی

اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔غرض جہاں مثنوی ''گلشن عشق'' ایک طرف تہذیبی عناصر کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے تو دوسری طرف اس زبان و بیان کے لحاظ کی بنا پر یہ مثنوی دکن کی دوسری ادبی مثنویوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

مثنوی ''گلشن عشق'' کے کئی نسخے ملتے ہیں۔انگلستان میں سات (7)، حیدرآباد (سالار جنگ) میں آٹھ (8)، ادارۂ ادبیات اُردو (حیدرآباد) میں چار (4)، پاکستان (کراچی) میں چار (4) نسخے ملتے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

حیدرآباد (سالار جنگ) کے نسخوں کی تفصیل:

1: نمبر (35)، سائز (6x9)، صفحہ (140)، سطر متن (18)، حاشیہ (20) شعر شامل، خط ثلث، کاغذ دیسی، چند کاغذ بلو یہی ہیں، مصنف نصرتی، تاریخ تصنیف 1068ھ، کتابت......

آغاز:

صفت اس کی قدرت کی اول سراؤں دھر یا جس نے یو گلشن عشق ناؤں کر یا کرم عشق کا تس ایہال بو باغ آفرینش کا پکڑیا جمال۔

اختتام:

لکھا ہوں جو یو قصہ خوش وہاں سوں
علی شاہ عادل کرے ناںوں سوں
تلک جگ میں مقبول اچھی یو مدام
بحق محمد علیہ السلام (16)

2۔ نمبر (128)، سائز (15x9)، صفحہ (303)، سطر (15)، خط ثلث، کاغذ دیسی، کرم خوردہ۔

خاتمہ:۔ راقم الحروف میر زین العابدین، مختوم تاریخ بست و ششم صفر 1189ھ، منقول از کتاب استادی، امجدی مکرمی معظمی حضرت میر لطف اللہ صاحب سلمہ اللہ تعالی۔(17)

3۔ نمبر (29)، سائز (6x9)، صفحہ (354)، سطر (13)، خط نستعلیق، کاغذ دیسی، کتابت 1193ھ۔

خاتمہ:۔ تمت کلمۃ رب صدقاً وعدلا ھذا الکتاب۔

''گلشن عشق''، بتحریر پہاڑ خاں دیوان سالک۔ دیوانی ساکن دیودرک صومت انجام واتمام پذیرفت مرتبہ ایں کتاب شہر اسفندار ماہ ذیحہ تاریخ بست ششم مرتب شد 1193ھ (18)۔

4۔ نمبر (30)، سائز (5x12)، صفحہ (430)، سطر (12)، خط نستعلیق، کاغذ دیسی، پہلا صفحہ مطلا مذہب، مطلا جدول خوشخط۔ (19)

5۔ نمبر (392)، سائز (5x8)، صفحہ (186)، سطر (15)، خط ثلث، کاغذ دیسی، ناقص الاول اور ناقص الآخر ہے۔ (20)

6۔ نمبر (431)، سائز (9-1/2x6-1/2)، صفحہ (328)، سطر (14)، خط نستعلیق، کاغذ دیسی۔

خاتمہ:۔ اختتام کتاب چنیاوتی بروز چہارشنبہ بتاریخ پنجم شہر شعبان المعظم، از دست فقیر حقیر عبد ضعیف رضا علی ابن حاجی محمد حسینی دار الغنی......

ابن کتاب بتاریخ پنجم جمادی الاول 1235ھ......صاحب ومحمد رضا خاں صاحب پنج روپیہ خرید نمودہ شد۔ (21)

7۔ نمبر (473)، سائز (8-1/2x5-1/2)، صفحہ (340)، سطر (13)، خط نستعلیق، کاغذ دیسی، کتابت 1341ھ۔

خاتمہ:۔ بتاریخ شانزدہم ماہ محرم الحرام 1241ھ در مقام کوجتور برائے خواند...... کاتب الحروف......سیوک رام لالہ گنگارام۔ مالک ابن عبدالقادر۔ (22)

8۔ نمبر (497)، سائز (9x6-1/2)، صفحہ (310)، سطر (15)، خط نستعلیق، کتابت 1113ھ۔

خاتمہ:۔ بتاریخ پنجم ماہ ربیع الثانی 1113ھ بروز پنجشنبہ بوقت......از مقام شریتی قصہ ''گلشن عشق'' تصنیف حضرت نصرتی ملک الشعراء برائے سری لالہ کچھمن چند منشی سرکار سری......جیو۔ (23)

کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو (حیدر آباد) کے نسخوں کی تفصیل۔

1۔ زیر نظر مخطوطہ بڑی حد تک مکمل اور نہایت قدیم ہے۔ خط ثلث میں 1100ھ کے قریب لکھا گیا ہے۔ بہت ہی کرم خوردہ ہو گیا ہے۔

یہ نسخہ مولانا سید علی اصغر بلگرامی صاحب (وظیفہ یاب صوبہ دار اورنگ آباد، مولف ماثر الکرام ومرتب حدیقۃ

السلاطین) کا عطیہ ہے۔اس کے سرورق پر ایک بیضوی مہر پر ''کتب خانہ سید علی اصغر بلگرامی'' کندہ ہے۔ایک دوسری مربع مہر بھی ثبت ہے جس پر ''محمد قطب الدین 1212ھ'' کندہ ہے۔گویا یہ کتاب 1212ھ میں محمد قطب الدین کی ملک تھی۔اوراق (151)،سطور فی صفحہ (14)،سائز (8-1/2x6)۔(24)

2۔ ''نصرتی کی گلشن عشق'' کا زیرنظر نسخہ ناقص الطرفین ہے۔لیکن اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کی کتابت قدیم ہے...... یہ مخطوطہ ابتداء میں خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔لیکن بعد میں کاتب نے خط ثلث اختیار کیا ہے۔کوئی ترقیمہ وغیرہ نہیں ہے۔ورق (150)،سطور فی صفحہ۔۔۔،سائز (6x8-1/2)۔(25)

3۔ گلشن عشق کا زیرنظر نسخہ مکمل ہے۔اور 1198ھ بہ مقام قلعہ کلیانی نقل کیا گیا ہے۔اس نسخے میں چار ہزار سے زیادہ ابیات ہیں۔خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔عنوانات سرخ روشنائی میں ہیں۔درمیان میں جگہ جگہ خط ثلث میں بھی بعض ورق لکھے ہوئے ہیں۔ابتداء قصیدہ کے اشعار سے ہوتی ہے جو بطور عنوان ہر نئی فصل کے اوپر درج کئے گئے ہیں۔

ترقیمہ:۔

تمام شد بتاریخ بست و پنجم جمادی الاول 1198ھ بروز جمعہ، بوقت استویٰ، ورق (127)،سطور فی صفحہ (17)،سائز (6x8)۔(26)

4۔ زیرنظر مخطوطہ ناقص الطرفین ہے۔صرف چند ابتدائی اور آخری ابیات اس میں محفوظ ہیں۔نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔حاشیہ کی جدولیں اور عنوانات سرخ روشنائی میں ہیں۔اہتمام سے نقل ہوا ہے۔کاغذ اور سیاہی کے لحاظ سے 1150ھ کے قریبی زمانہ کی کتابت معلوم ہوتی ہے۔یہ نسخہ مولوی احمد اللہ خاں صاحب بی اے بی ایڈ کا عطیہ ہے۔ورق (126)،سطور فی صفحہ (18)،سائز (5-1/2x7)۔(27)

کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) کے نسخوں کی تفصیل:

1۔ نمبر مثنوی (299)، سائز (6x9)،صفحہ (238)،سطر (17)، خط نسخ،مصنف نصرتی، تاریخ تصنیف 1068ھ، کتابت 1164ھ۔

ترقیمہ:۔

کاتب الحروف قصہ گلشن بندۂ درگاہ محمد غلام احمد در شہر حیدرآباد بتاریخ بست و ہشتم شہر جمادی الاول

1164ھ روز یکشنبہ۔(29)

2۔ نمبر مثنوی(343)، سائز(6x8)، صفحہ(352)، سطر(13)، خط نسخ۔(30)

انجمن ترقی اُردو پاکستان کے نسخوں کی تفصیل:

1۔ سائز(9-1/4x5-1/4)، صفحات(186)، سطور(21)، سنہ تصنیف 1068ھ۔(32)

2۔ سائز(8x8)، صفحات(440)، سطور(95)، صفحات(179) تک، اُس کے بعد(11)، سنہ تصنیف 1068ھ۔ ''گلشن عشق'' کا یہ مخطوطہ جلی نستعلیق خط میں ہے۔ کاتب نے اپنا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں کیا۔ آخری ورق سے قبل کے ورق پر ایک مدور مہر ہے جس میں خواجہ تاج الدین 1273ھ تحریر ہے۔ یہ شاید اس نسخے کے مالک تھے اور اس مہر کے نیچے کسی بدخط آدمی نے والد خواجہ معید الدین لکھ دیا ہے۔

ترقیمہ:۔

خط نستعلیق، کاغذ کافی دبیز ہے لیکن اس کے باوجود اوراق کہیں کہیں کرم خوردہ نظر آتے ہیں۔(33)

3۔ سائز(9-1/2x5)، صفحات(354)، سطور(13)، سنہ تصنیف 1068ھ، کتابت 1208ھ نسخہ ہذا کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اول تو نہایت خوشنما خط نستعلیق میں اس کی کتابت ہوئی ہے۔

ترقیمہ اول:۔

گلشن عشق در میلا پور معرفت حافظ مکی از دست غلام محمد کاتب بتاریخ 14 ربیع الثانی 1207ھ نویسائیندہ شد۔

ترقیمہ دوم:۔ تمت الکتاب بعنوان اللہ الملک الوہاب بتاریخ بیست ونہم شہر جمادی الاول 1208ھ۔ بفضل الٰہی بتاریخ نہم جمادی الثانی 1208ھ بصحت صحیحہ رسید بمند وکمال کرمہ۔(34)

4۔ سائز(8-1/2x6)، صفحات(463)، سطور(11)، سنہ تصنیف 1068ھ، سنہ کتابت 1182ھ۔ گلشن عشق کا یہ نسخہ خط ثلث میں ہے۔

کتاب ''گلشن عشق''، نصرتی وغیرہ بتاریخ 3 ذیقعدہ 1279ھ نو خریدی در ہراج فوجداری داخل کتابخانہ سرکار گردید۔

ترقیمہ:۔ کتاب گلشن عشق نصرتی از تصنیف نصرتی غفر اللہ تعالیٰ دنبہ ومرقوم شد از ید کاتب الضعیف شیخ محمد شریف

سلمہ اللہ تعالیٰ وتحریر یافت در ماہ جمادی الثانی 1186ھ بتاریخ پانزدہم شہر مذکور بروز جمعہ بوقت ظہر اتمام یافت۔(35)

انگلستان کے نسخوں کی تفصیل:

انڈیا آفس میں چار نسخے۔ برٹش میوزیم میں ایک نسخہ۔آکسفرڈ میں ایک نسخہ اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں ایک نسخہ ہے۔

1۔ انڈیا آفس بلوم ہارٹ نمبر(104)، ورق(155)، سائز(6x1/2-9)، سطر(11)، خط نستعلیق، کاتب غلام قادر تاریخ کتابت 13 شوال 1199ھ۔

2۔ نمبر(105)، ورق(154)، سائز(1/4-4x8)، سطر(11)، خط نستعلیق، کاتب غلام صفدر، تاریخ کتابت 3 شعبان 1210ھ۔

3۔ نمبر(106)، ورق(201)، سائز(3/4-5x1/4-8)، سطر(11 تا 17)، خط نسخ۔

4۔ نمبر(107)، ورق(154)، سائز(5x1/2-8)، سطر(11)، خط نسخ۔

برٹش میوزیم نمبر(1059۔اورینٹل)، ورق(191)، سائز(1/2-6x1/2-10)، سطر(11 تا 13)، خط نسخ۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی نمبر(8)، ورق(201)، سطر(11)، خط نسخ، تاریخ کتابت 7 ربیع الاول 1164ھ۔

آکسفرڈ نمبر(43)، ورق(83)، سائز(1/4-4x1/2-6)، سطر(13)، خط نستعلیق۔(36)

مثنوی ''گلشن عشق'' کو مولوی عبدالحق مرتب کرنے سے قبل سید محی الدین قادری زورؔ نے تصنیف ''اُردو شہ پارے'' (جلد اول)1929ء میں نصرتی کا نام، حالات زندگی، اور تصانیف پر تفصیلی بحث کی ہے۔اس کے بعد نصیر الدین ہاشمی نے تصنیف ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' 1932ء میں نصرتی کے حالات زندگی اور تصانیف کے علاوہ انگلستان میں موجود مثنوی ''گلشن عشق'' کے تمام نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔

مثنوی ''گلشن عشق'' کو مولوی عبدالحق نے 1952ء میں مرتب کر کے انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کراچی سے شائع کیا۔مولوی عبدالحق کی مرتبہ تصنیف کی تفصیلات کچھ اس طرح ہے۔ابتداء کے 12 صفحات میں مقدمے، 223 صفحات میں متن، اور 26 صفحات میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دی ہے۔یہ مثنوی ٹائپ میں

شائع ہوئی ہے۔مثنوی ’’گلشن عشق‘‘ کا مقدمہ صرف 12 صفحات پر مشتمل ہے۔مقدمے میں نہ تو مصنف کے حالات زندگی،موضوع تصنیف،اور نہ ہی مثنوی ’’گلشن عشق‘‘ کے نسخوں کی تفصیلی بحث لکھی ہے۔ بلکہ چند باتوں کا ذکرصرف سرسری طور پر کیا ہے۔مولوی عبدالحق نے مثنوی ’’گلشن عشق‘‘ کو کتنے نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا ہے۔اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔صرف اتنا ہی لکھا ہے۔

مولوی عبدالحق کی مرتبہ مثنوی میں کل اشعار کی تعداد 4530 ہے جبکہ سید محمد کی مرتبہ مثنوی ’’گلشن عشق‘‘ میں کل اشعار کی تعداد 4444 ہے۔

> ’’میرے پاس اس کتاب کے کئی نسخے ہیں۔ان میں سب سے قدیم 1093ھ کا ہے یعنی تصنیف سے 25 سال بعد کا۔‘‘(37)

قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی ’’گلشن عشق‘‘ کومولوی عبدالحق نے چار نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا ہے کیونکہ افسر صدیقی امروہوی نے تصنیف ’’مخطوطات انجمن ترقی اُردو‘‘(پاکستان) جلد پنجم میں مثنوی گلشن عشق کے چار نسخوں کی تفصیل دی ہے۔اورمولوی عبدالحق کے بنیادی نسخے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’حمد سے پہلے جو اَبیات نسخہ اول میں تھیں وہ اس نسخہ میں موجود نہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے مطبوعہ نسخے کی بنیاد یہی مخطوطہ ہے۔کیونکہ دوسرے نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد جن الفاظ کو نادرست سمجھا گیا ہے یا جو پڑھنے میں صحیح طور پر نہیں آئے ان کا بدل پنسل سے حاشیے پر درج کیا گیا ہے۔(38)

ایک اور نسخے میں مولوی عبدالحق کی تحریر کی طرف اشارہ کیا ہے لکھتے ہیں:

> ’’اصل نسخہ کا ابتدائی ورق ضائع ہو گیا ہے جسے کسی اور کاتب نے لکھا ہے۔ یہ خط کل مثنوی کے خط سے مختلف ہے۔صفحہ اول پر بابائے اُردو نے ’’گلشن عشق‘‘......نصرتی......1063ھ تحریر کیا ہے۔(39)

افسر صدیقی امروہوی کے ان اقتباسات سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی عبدالحق کی مرتبہ تصنیف مثنوی گلشن عشق کو مرتب کرتے وقت یہ تمام نسخے اُن کے پاس موجود تھے۔اگر مرتب مولوی عبدالحق

اپنے پاس کے نسخوں کی کیفیت مقدمے میں پیش کرتے تو یہ الجھن نہیں ہوتی تھی۔ مرتب نے نہ تو نسخوں کی کیفیت پر روشنی ڈالی ہے اور نہ ہی کوئی تفصیل دی ہے۔

ترتیب متن میں سب سے اہم مقدمہ ہوتا ہے۔ مرتب کو اپنی ہر بات مقدمے میں کہنی ہوتی ہے۔ مرتب کو مقدمے میں موضوع تصنیف اور اُس کے ماخذ پر بھی روشنی ڈالنی ہوتی ہے۔ مثنوی ''گلشن عشق'' میں ایک اہم نکتہ مثنوی ''گلشن عشق'' کے ماخذ کا بھی ہے۔ مولوی عبدالحق سے قبل شمس اللہ قادری نے مثنوی ''گلشن عشق'' کے ماخذ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گلشن عشق میں منوہر و مدمالتی کے حسن و عشق کی داستان مذکور ہے۔ اس میں کم و بیش چار ہزار اشعار ہیں اور 1068ھ میں تمام ہوئی......
>
> عاقل خاں رازی نے بھی منوہر و مدمالتی کے فسانہ کو 1065ھ میں فارسی میں نظم کیا اور مہر و ماہ اس کا نام رکھا ہے......
>
> خافی خان نے گلشن عشق کو اسی مثنوی کا ترجمہ سمجھا ہے۔ لیکن نصرتی نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا ہے کہ یہ مثنوی ''مہر و ماہ'' کا ترجمہ یا اُس سے ماخوذ ہے۔(40)

شمس اللہ قادری کے بعد نصیر الدین ہاشمی تصنیف ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' میں مثنوی ''گلشن عشق'' کے ماخذ کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کنور منوہر اور مدمالت کے قصے کو اولاً شیخ منجمن یا جمن نے ہندی میں لکھا تھا۔ اور اس کے متعلق ہماری کچھ معلومات نہیں ہیں۔ ہم یہ نہیں بیان کر سکتے کہ یہ کون تھے اور انہوں نے کب اس کو لکھا تھا۔ اور اس میں قصے کی صراحت کس طرح تھی......
>
> سب سے پہلے کسی نامعلوم شخص نے 1059ھ میں کنور منوہر و مدھومالت کے نام سے اس کو منظوم کیا ہے......

اس مضمون کی دوسری کتاب عاقل خاں رازی کی ''مہر و ماہ'' ہے
جس کی تصنیف 1065ھ میں ہوئی ہے......(41)

شمس اللہ قادری اور نصیر الدین ہاشمی کے ان اقتباسات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا لگتا ھیکہ مولوی عبدالحق نے اپنی مرتبہ تصنیف مثنوی ''گلشن عشق'' کے مقدمے میں مثنوی کے ماخذ پر جو روشنی ڈالی ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''تحقیق سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس سے قبل بھی تحریر میں آ چکا ہے۔ ایک صاحب شیخ منجھن نامی نے اسے ہندی میں لکھا تھا۔ یہ کتاب اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ اس کا حوالہ ایک دوسری کتاب مسمّٰی ''قصہ کنور منوہر و مدمالت'' میں ملتا ہے۔ یہ فارسی مثنوی ہے۔ مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا۔ البتہ سنہ تصنیف 1059ھ ہے۔ اس میں مصنف نے شیخ منجھن کی ہندی کتاب کا ذکر کیا ہے اور اپنے قصے کی بنیاد اُسی پر رکھی ہے۔ تیسری کتاب عاقل خاں رازی عالمگیری کی مثنوی ''مہر و ماہ'' ہے جو 1065ھ کی تصنیف ہے جیسا کہ وہ خود اپنی مثنوی کے آخر میں لکھتا ہے:

ز ھجرت یک ہزار و شست و پنج است
کزیں غم نامہ طبعم نقطہ سنج است
جو من ایں داستاں از غم زدم دم
بخواں تاریخ آں ''دیباچہ غم''

اس میں بھی یہی قصہ ہے۔ رازی نے منوہر کو مختصر کر کے مہر کر دیا ہے۔ یہ تینوں کتابیں ''گلشن عشق'' سے پہلے کی تصنیف ہیں کیونکہ ''گلشن عشق'' کا سنہ تصنیف 1067ھ ہے جیسا کہ خود اُس نے مثنوی کے آخر میں تاریخ تصنیف ایک مصرع سے نکالی ہے۔

دہریا اس کی تاریخ کا جب خیال　　وہیں ہاتف غیب معجز مقال
کیا اُس کی تاریخ یوں ہجری　　مبارک یو ہے ہدیہ نصرتی

(42)

مولوی عبدالحق کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ’’گلشن عشق‘‘ سے پہلے دو فارسی مثنویاں جس میں ’’کنوہر منوہر و مدمالتی‘‘ 1059ھ اور دوسری عاقل خاں رازی کی ’’مہر و ماہ‘‘ 1065ھ میں لکھی گئیں۔ دراصل مثنوی ’’گلشن عشق‘‘ سے قبل اسی قصے پر دو ہندی مثنویاں بھی لکھی گئیں جس کا ذکر کرتے ہوئے سید محمد لکھتے ہیں:

> ’’ہندی ادب کی مروجہ تاریخوں میں عام طور پر شیخ منجھن کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ حالیہ تحقیقات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیخ منجھن ملک جائیسی مصنف ’’پدماوت‘‘ 1545ء سے بہت پہلے گذرے ہیں کیونکہ جائیسی نے اپنی ’’پدماوت‘‘ میں میگاوتی کی طرح مدمالتی کی پریم کتھا کا ذکر کیا ہے۔ یہ نظم بھی پدماوت ہی کی طرح دوہے اور چوپائیوں میں لکھی گئی ہے۔ اس کی تصنیف کا زمانہ ٹھیک سے معلوم تو نہیں لیکن اتنا ثابت ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف ’’پدماوت‘‘ سے پہلے لکھی گئی تھی بلکہ کافی مشہور ہو چکی تھی۔ شیام سندر مصنف ’’تاریخ ادب ہندی‘‘ کا خیال ہے کہ ’’مدمالتی‘‘ کا قصہ منجھن نے 1500ء سے لیکر 1510ء کے لگ بھگ لکھا ہوگا۔‘‘(43)

سید محمد کے اس اقتباس کے مطالعہ سے دونئی باتیں ایک شیخ منجھن کی مثنوی ’’مدمالتی‘‘ کا زمانہ (1500 تا 1510ء) اور دوسری ملک جائیسی کی مثنوی پدماوت (1545ء) سامنے آتی ہیں۔

اس کے بعد 2001ء میں گوپی چند نارنگ نے تصنیف ’’ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں‘‘ میں اُردو مثنویوں پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ’’اُردو میں جو ہندوستانی لوک کہانیاں مثنوی کے پیرائے میں

بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک ''کنور منوہر اور مد مالت'' کے عشق کا یہ قصہ بھی ہے۔ اس کی اصل کسی سنسکرت کتاب تک نہیں پہنچتی۔ خیال ہے کہ یہ قصہ ان لوک کہانیوں پر مبنی ہوگا جنھیں قدیم زمانے میں کتھک سنایا کرتے تھے۔ اولاً کسی شخص شیخ منجھن نے اُسے ہندی میں لکھا تھا۔ یہ کتاب اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ وارڈ نے لکھا ہے کہ ایک کتاب ''مدھو مالتی'' جو یورپی بولی میں ہے، غالبًا وہ یہی ہے۔ بعد کے ایک فارسی نسخے میں جو 1059ھ میں لکھا گیا ہے، مصنف نے وضاحت کی ہے کہ اس نے یہ قصہ شیخ منجھن کی ہندی کتاب سے ترجمہ کیا ہے۔

منجھن کی ''مد مالتی'' کا چونکہ ابھی تک کوئی مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اس لئے اس کا سنہ تصنیف معلوم نہیں۔ رام چند شکل کی رائے ہے کہ یہ سمت 1550 اور 1595ء کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی ہوگی۔''(44)

گوپی چند نارنگ نے رام چند سکل کے حوالے سے شیخ منجھن کا زمانہ سمت 1550ء تا 1595ء دیا ہے۔ اور ملک جائیسی کی مثنوی پدماوت کے زمانے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ راقمہ الحروف رام چند سکل اور گوپی چند نارنگ کی تحقیق سے اتفاق نہیں رکھتی کیونکہ اگر شیخ منجھن کا زمانہ 1550ء تا 1595ء ہے تو پھر ملک جائیسی کی مثنوی ''پدماوت'' کی سنہ تصنیف جو 1545ء ہے وہ شیخ منجھن سے پہلے کی ہو جاتی ہے جبکہ مثنوی ''پدماوت'' 1545ء یعنی شیخ منجھن کے بعد کی ہے۔ تمام محققین کی تحقیق کو سامنے رکھ کر مثنوی ''گلشن عشق'' کا شجرہ کچھ اس طرح ہے۔

مثنوی گلشن عشق

شیخ منجھن...... ''مدھو مالتی''، سمبک 1500ء تا 1510ء (ہندی)

ملک محمد جائیسی...... ''پدماوت'' 1545ء (ہندی)

نامعلوم...... ''کنور منوہر و مد مالتی'' 1059ھ (فارسی)

عاقل خاں رازی......''مہر وماہ''1064ھ (فارسی)

نصرتی......''گلشن عشق''1068ھ (دکنی)

حسام الدین حصاری......''حسن وعشق''1071ھ (اُردو)

مادھوداس گجراتی......''میکا ومنوہر''1098ھ (گجراتی)

نامعلوم......''قصہ مدھ مالت'' " "

نامعلوم......''پدماوتی ومنوہر'' " "

اصغری......''منوہر ومدمالا'' " "

نامعلوم......''منوہر ومدھمالت'' 1218ھ

شمس اللہ قادری نے ''اُردوئے قدیم''، مولوی عبدالحق نے مثنوی ''گلشن عشق''، سید محمد نے مثنوی ''گلشن عشق''، پروفیسر گیان چند، سیدہ جعفر نے ''تاریخ ادب اُردو'' (جلد سوم)، اور گوپی چند نارنگ نے ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں'' میں یہ لکھا ھیکہ نصرتی نے مثنوی ''گلشن عشق'' میں کہیں بھی اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے کہ اُس نے قصہ کہاں سے لیا۔ صرف تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ مثنوی کا ماخذ شیخ منجھن کی مثنوی ''مدھو مالتی'' سے ملتا ہے۔ لیکن مثنوی ''گلشن عشق'' کی اندرونی شہادت سے یہ بات واضح ہوتی ھیکہ نصرتی نے مثنوی ''گلشن عشق'' میں اپنے ماخذ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' میں نصرتی کے ماخذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نصرتی نے اپنے کلام میں کہیں یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ اس نے کسی خاص فارسی قصہ سے اِس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس خصوصی میں جو اشعار ''گلشن عشق'' میں آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

میری طبع کی تیز تازی کی تین ۔۔۔ یون سون کر نہار بازی کی تین
ہر اک داستان بوستان ۔۔۔ ہر یک بیت ہر یک محل جانشین
معانی کی صورت کی ہے آرسی ۔۔۔ کہیا شعر دکہن کون جون فارسی
فصاحت میں کر فارسی خوش کلام ۔۔۔ دہرے فخر ہندی بچن پر مدام

دگر شعر ہندی کی بازی ہنر　　تسکتن ہیں لیا فارسی میں سنور
میں اس دو ہنر کے خلاصہ کوں پا　　کہیا شعر ایسا دونوں فن ملا
دیو پن داد سن فارسی شعر دان　　جو ہندی سنی ہے کہیں دل سون تان
آ دیکہا اگر ہو حسد سون کہاب　　رکھی بول جو دکہنی کتاب

> اگر شعر نمبر 3 سے ضرور شبہ ہوتا ہے کہ نصرتی نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے مگر شعر نمبر 5، 6 سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندی اور فارسی دونوں کتابوں کو پیش نظر رکھ کر تصنیف کی گئی ہے۔ خصوصاً شعر 5 سے صاف طور پر واضح ہے کہ دو ہنر (فارسی) اور (ہندی) کے خلاصہ سے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔(45)

راقمۃ الحروف کو نصیر الدین ہاشمی کی اس بات سے اتفاق ھیکہ نصرتی نے مثنوی ''گلشن عشق'' میں اپنے ماخذ کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ ''در تعریف کتاب'' کے باب میں کھلے الفاظ میں لکھا ہے کہ میں نے ہندی اور فارسی زبان کے دو ہنروں کو ملا کر دکنی زبان میں اپنی کتاب لکھی۔

نصرتی نے ''گلشن عشق'' 1068ھ م 1657ء میں لکھی۔ مثنوی ''گلشن عشق'' سے قبل شیخ منجھن کی مثنوی ''مدھو مالتی'' (1500ء تا 1510ء)، ملک جائیسی کی مثنوی ''پدمات'' (1545ء)، ''کنور منوہر و مد مالتی'' (1059ھ) اور عاقل خاں رازی کی مثنوی ''مہر و ماہ'' (1065ھ) ملتی ہیں۔ یہ تمام مثنویاں نصرتی کے سامنے تھیں اور ان ہی فارسی اور ہندی مثنویوں کو سامنے رکھ کر نصرتی نے اپنی مثنوی ''گلشن عشق'' لکھی۔ جن اشعار میں نصرتی نے اپنے ماخذ کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

ہر یک داستان بوستاں دل گزیں　　ہر یک بیت ہے یک محل جانشیں
معانی کی صورت نے ہو آرسی　　کیا شعر دکھنی کوں جبوں فارسی
فصاحت میں گر فارسی خوش کلام　　دھرے فخر ہندی پر مدام
وگر شعر ہندی کے بعضے ہنر　　نہ سکتے ہیں لیا فارسی سوں سنور
میں اس دو ہنر کے خلاصیاں کوں پا　　کھیا شعر ایسا دونو فن ملا

دیویں داد سن فارسی شعر داں　　جو ہندی سنے بی کہیں دل سوں ہاں
آ دیکھا اگر ہو حسد سوں کباب　　کھے بول اتنا کہ دکھنی کتاب
سمج دار کوں خوب سودے سوں کام　　نہ دوکان دیکھ نہ سقف مبام
کہ ہو جس زباں میں سخن نام دار　　رہے وہ زمانے پہ ہو یادگار
دیویں گوش ہور دل کوں ارباب ذوق　　مرا شعر سن بھی سمجھنے تے شوق
سرس شعر دیکھے تو کان خوش لگائے　　کہ الوان نعمت دُکھی کوں نہ بھائے
کریں بے سمج یا جو حاسد اداس　　تو دونو بھی معذور ہیں میرے پاس

(46)

نصرتی نے تین بادشاہوں کا دور دیکھا۔ اور اُس نے ہر دور میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ محمد عادل شاہ کے دور میں اپنی پہلی مثنوی ''گلشن عشق'' (1068ھ م 1657ء) لکھی۔ علی عادل شاہ ثانی کے دور میں اپنی دوسری مثنوی ''علی نامہ'' 1071ھ میں لکھی اور اپنی آخری مثنوی تاریخ اسکندری (1083ھ) سکندر عادل شاہ کے دور میں لکھی۔ نصرتی نے مثنوی ''گلشن عشق'' میں جہاں اپنے حالات زندگی کا ذکر کیا ہے وہیں اپنے دوستوں اور ہمعصروں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے مثنوی ''گلشن عشق'' کے مقدمے میں صرف نصرتی کے ایک دوست کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اُس کے ایک دوست مسمیٰ نبی ابن عبدالصمد نے اس قصے کو لکھنے کی ترغیب دی۔'' (47)

نصرتی کے دور کو اُردو شعر و شاعری کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اُس کے دور میں بڑے بڑے علماء فضلا، اور شعراء گذریں ہیں جن میں حکیم آتشی (''پانچ مثنویاں'')، ظہوری کا فرزند ملا ظہور (''محمد نامہ'')، ملا محمد حسین (''احوال اسلاطین'')، قاضی نوراللہ شاہ (''تاریخ علی عادل شاہی'')، صنعتی (''قصہ بے نظیر'' 1055ھ)، اس کے علاوہ قاضی کریم اللہ، شاہ کمال، علامہ فتح اللہ شیرازی، ارسطو زماں ملا، مرزا مقیم، عبدالقادر، دولت شاہ اور شاہ ابوالمعانی وغیرہ شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ان میں سے کسی پر بھی کوئی تفصیلی بحث نہیں کی ہے۔

مثنوی ''گلشن عشق'' میں ایک اہم نکتہ کتابِ ''نورَس'' ہے۔ سید شمس اللہ قادری نے تصنیف ''اُردوئے

قدیم'' ص 78، اور سید محی الدین قادری زور نے تصنیف ''اُردو شہ پارے'' ص 34، میں کتاب نورس کا نام ''نورس نامہ'' تحریر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اپنی مرتبہ مثنوی ''گلشن عشق'' کے مقدمے میں ''کتابِ نورس'' ''نورس نامہ'' تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ابراہیم عادل شاہ ثانی 1579ء م 988ھ کے وقت ملک کے عروج فروغ، رعیت کی خوش حالی اور علم و کمال کی سرپرستی برابر قائم رہی۔ علمی دنیا میں ''نورس نامہ'' اس کی بڑی یادگار ہے۔'' (48)

سید شمس اللہ قادری، سید محی الدین قادری زور اور مولوی عبدالحق نے ''کتابِ نورس'' کو ''نورس نامہ'' لکھا ہے۔ جبکہ ''نورس نامہ'' محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ ''گلشن ابراہیمی'' کو کہا جاتا ہے۔ ''کتاب نورس'' دراصل ابراہیم عادل شاہ کے گیتوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر حبیب نثار ''کتابِ نورس'' پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

ابراہیم عادل شاہ ثانی، فنون لطیفہ کا رسیا تھا۔ وہ صرف ایک اچھا خطاط یا مصور ہی نہیں تھا بلکہ ایک ماہر فن موسیقی بھی تھا۔ اس نے دکنی زبان کو وسیلہ بناتے ہوئے محافل موسیقی میں گانے کی غرض سے گیت موضوع کئے ہیں جو راگ، راگنی کے سروں کے مطابق ہیں۔ اس نے اپنے گیتوں کے مجموعہ کا نام ''کتاب نورس'' قرار دیا تھا۔'' (49)

کتابِ نورس کو نذیر احمد نے 1955ء میں کئی نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے شائع کیا۔ گیان چند جین ''تاریخ ادب اردو'' میں کتاب نورس سے متعلق لکھتے ہیں:

''اپریل 1955ء میں نذیر احمد نے مختلف کتب خانوں کے نو نسخوں کی مدد سے ''کتاب نورس'' کے متن کو مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ کتابِ نورس'' کا دیباچہ فارسی کے مشہور انشاپرداز ظہوری نے 1008ھ میں تحریر کیا تھا۔ کتاب ''نورس'' کی تاریخ تصنیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ ظہوری کے اس بیان سے کہ بادشاہ کی عمر تیسرے عشرے میں ہے، ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں

کہ ''کتاب نورس'' 1009ھ سے قبل مرتب ہو چکی تھی۔ نذیر احمد لکھتے ہیں چونکہ ظہوری کا ورود بیجاپور 1004ھ کے قبل ثابت نہیں ہوسکتا، اس لئے ''کتاب نورس'' کی تکمیل 1004ھ اور 1008ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ یہی مصنف اپنی کتاب ''ظہوری لائف اینڈ ورکس'' میں رقمطراز ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی ''کتاب نورس'' 1005ھ میں مکمل ہوئی تھی اور ظہوری اور ملک قمی کے دیباچے 1005ھ یا 1006ھ میں لکھے گئے تھے۔ جمیل جالبی نے اس کا سن تصنیف 1006ھ مطابق 1597ء بتایا ہے۔(50)

گیان چند جین کتاب نورس کے گیتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں۔ اقتباس دیکھئے:

''کتابِ نورس'' میں ایک راگ یا راگنی کو عنوان قرار دے کر اس کے تحت گیت موضوع کئے گئے ہیں۔ یہ گیت مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان میں ربط و تسلسل نہیں۔ ''کتاب نورس'' سترہ راگوں کے ذیل میں 59 گیت اور سترہ دوہرے موجود ہیں۔ رام کیسری، اسادری، توڑی، بھیرو، دھناسری، ملار، جیجز، پوریا، گوی، کنڑا، کرنائی کیدار، نوروز، بھوپالی، ماروس، براری، اور کلیاں میں مختلف گیت موضوع کئے گئے ہیں۔ ہر گیت کے نام سے پہلے ''درمقام'' اور بعد میں ''نورس'' کے الفاظ تحریر کئے گئے ہیں۔''(51)

''گلشن عشق'' میں موجود اس نکتہ پر مولوی عبدالحق نے کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے جس کی وجہ سے اکثر مقامات پر ابہام کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

حوالے:

1۔ گیان چند جین۔سیدہ جعفر ''تاریخ ادب اُردو'' جلد اول۔ص195۔1998ء

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً ص252

4۔ مولوی عبدالحق ''نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور کے حالات وکلام پر تبصرہ''ص14-13۔1962ء

5۔ نصرتی۔مثنوی ''گلشن عشق'' مرتب مولوی عبدالحق۔ص30۔1952ء

6۔ ایضاً ص30

7۔ ایضاً ص21-20

8۔ مولوی عبدالحق ''نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور کے حالات وکلام پر تبصرہ''ص10۔

9۔ گیان چند جین۔سیدہ جعفر ''تاریخ ادب اُردو'' جلد سوم۔ص73-72۔1998ء

10۔ نصرتی۔مثنوی ''گلشن عشق'' مرتب سید محمد۔ص6۔1940ء

11۔ مولوی عبدالحق۔''نصرتی''۔ص51-250

12۔ ایضاً ص247

13۔ جمیل جالبی۔''ادبی تحقیق'' ص256۔ 2004ء

14۔ مولوی عبدالحق۔''نصرتی''۔ص15

15۔ سید محمد۔''نصرتی کا سنہ وفات''۔از مضمون رسالہ ''سب رس'' شمارہ جنوری1940ء۔ص128

16۔ نصیرالدین ہاشمی۔''اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست''۔ص99-598۔1957ء

17۔ ایضاً ص600-599

18۔ ایضاً ص600

19۔ ایضاً ص01-600

20۔ ایضاً ص602-601

21۔ ایضاً ص603-602

22۔ ایضاً ص603

23۔ ایضاً ص603

24۔ سیدمحی الدین قادری زور۔''فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اُردو''(جلد پنجم)ص41-42

25۔ ایضاً ص137-38(جلدسوم)

26۔ ایضاً ص220

27۔ ایضاً ص237

28۔ ایضاً ص (جلدچہارم)

29۔ نصیرالدین ہاشمی۔''یورپ میں دکنی مخطوطات''(جلداول)ص98۔1961ء

30۔ ایضاً ص98

31۔

32۔ افسر صدیقی امروہوی۔''مخطوطات انجمن ترقی اُردو''(جلدپنجم)پاکستان۔ص223۔1978ء

33۔ ایضاً ص225-26

34۔ ایضاً ص226-27

35۔ ایضاً ص227-28

36۔ نصیرالدین ہاشمی۔''یورپ میں دکنی مخطوطات''۔ص257۔1932ء

37۔ نصرتی۔مثنوی''گلشن عشق''مرتب مولوی عبدالحق۔ص11

38۔ افسر صدیقی امروہوی۔''مخطوطات انجمن ترقی اُردو''(جلدپنجم)۔ص225۔

39۔ ایضاً ص227

40۔ شمس اللہ قادری۔''اُردوئے قدیم''۔ص86۔1928ء

41۔ نصیرالدین ہاشمی۔''یورپ میں دکنی مخطوطات''۔ص273-74

42۔ نصرتی۔مثنوی''گلشن عشق''مرتب مولوی عبدالحق۔ص10-11

43۔ نصرتی۔مثنوی''گلشن عشق''مرتب سید محمد۔ص15-16

44۔ گوپی چند نارنگ۔ ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں''۔ص95۔2001ء

45۔ نصیرالدین ہاشمی۔ ''یورپ میں دکنی مخطوطات''۔ص78-277

46۔ نصرتی۔مثنوی ''گلشن عشق'' مرتب مولوی عبدالحق۔ص221

47۔ ایضاً ص10

48۔ ایضاً ص1

49۔ حبیب نثار۔کتاب ''نورس کے قلمی نسخے اور شمس اللہ قادری''۔ مضمون رسالہ ''سب رس'' شمارہ جون 2011ء۔ص33

50۔ گیان چند جین۔سیدہ جعفر۔ ''تاریخ اُردو ادب''۔ص400۔1998ء

51۔ ایضاً ص401

باب دوّم

مولوی عبدالحق کی مرتبہ دکنی مثنویاں

(ج) ''جنگ نامہ عالم علی خاں''

جنگ نامہ عالم علی خاں ایک رزمیہ مثنوی ہے جس میں نظام الملک آصف جاہ اوّل اور عالم علی خاں کی جنگ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ مثنوی عالم علی خاں دکنی تاریخ کا ایک اہم آخذ ہونے کے ساتھ ساتھ مغل تہذیب اور تمدن کا بھی ایک اہم آخذ ہے۔ مثنوی کو غضنفر نے لکھا ہے۔ شاعر کے بارے میں اورنگ آباد میں لکھے جانے والے تذکروں اور اُردو ادب کی تاریخ میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ ہمیں یہ تک نہیں معلوم کہ غضنفر شاعر کا تخلص ہے یا نام، مثنوی کے مطالعہ سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ عالم علی خاں کا مصاحب تھا اور اسی بناء پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق دہلی سے تھا۔ جنگ نامہ عالم علی خاں کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عالم علی خاں اور میر قمر الدین خاں کے درمیان ہونے والی جنگ میں غضنفر خود بھی شامل تھا۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی حسن شوقی کی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور نصرتی کی مثنوی ''علی نامہ'' کی طرح ہی یہ مثنوی بھی چشم دید واقعات پر لکھی گئی ہے۔

جس کا ذکر محمد اکبر الدین صدیقی نے اپنی تصنیف ''بجھتے چراغ'' میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

> ''آصف جاہ نے دکن کا رُخ کیا اور قلعہ اسیر اور برہان پور پر قابض ہوگئے اور سادات نے اپنے بھتیجے عالم علی خاں صوبہ دار دکن کو احکام بھیجے کہ نظام الملک آصف جاہ کا مقابلہ کیا جائے۔ یہ جنگ ۱۱۳۲ھ ۱۷۲۰ء میں ہوئی اور آصف جاہ کی فتح ہوئی۔ عالم علی خاں کے ساتھ ایک شاعر غضنفر حسین غضنفر تھا۔ جس نے ایک مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں لکھی اور بہت سے چشم دید واقعات نظم کر کے ایک صحیح مگر مختصر سی منظوم تاریخ پیش کر دی۔ مثنوی میں کوئی ندرت نہیں۔ سیدھے سادھے انداز میں لکھی گئی ہے۔ وقتیہ تاثر زیادہ ہے۔ یہ مثنوی آصفی عہد کی پہلی مثنوی کہی جا سکتی ہے جس کو انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد نے شائع کیا ہے''۔ (ص......)

غضنفر نے مثنوی کے آخر میں سنہ تصنیف لکھ دیا ہے۔

ہزار ہور سو تیس تھے سنہ دو اُپر 1132ھ

محمد کی ہجرت کوں سن کان دھر

غضنفر کی مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں کو مولوی عبدالحق نے 1932 ھ کو مرتب کر کے انجمن ترقی اُردو کے تحت شائع کیا۔مثنوی کا مقدمہ صرف چار صفحات پر مشتمل ہے اور یہ مثنوی ٹائپ میں ہے۔مثنوی کے مقدمہ میں کوئی تفصیل موجود نہیں ہے اور نہ ہی کسی بھی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔صرف ایک دو باتوں کا ذکر سرسری طور پر کیا ہے۔مقدمہ کی ابتداء کچھ اس طرح ہوتی ہے۔

''فرخ سیر کے عہد سے لے کر محمد شاہ بادشاہ کے کچھ زمانے تک سید عبداللہ خاں (قطب الملک) اور سید حسین علی خاں (امیر الامراء) سادات بارہ سلطنت کے مالک ومختار تھے۔ یہ بادشاہ گر تھے اور بادشاہ اُن کے ہاتھوں میں کٹ پتلی تھے''۔(ص......)

مولوی عبدالحق نے مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں کے مقدمہ میں مخطوطات کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے اس جنگ نامے کے تین نسخے دستیاب ہوئے۔ایک نسخہ میرا ذاتی ہے۔اسے (ا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ مجھے مولوی عبدالحمید صاحب وکیل کنڑ نے عنایت فرمایا جو(ب) سے موسوم ہے۔ اور تیسرا وہ نسخہ ہے جو مسٹر ولیم آرون (William Iruine) نے مہاراجہ بنارس کے کتب خانہ سے حاصل کیا اور رسالہ انڈین اینٹی کیوری(Indian Antiquary) بابت ماہ جنوری و مارچ 1904ء میں مع انگریزی ترجمے کے شائع کیا۔یہ نسخہ (ج) ہے''۔(......)

اس کے علاوہ مقدمے میں اپنے طریقہ کار، اپنے بنیادی نسخہ کی تفصیل اور چند سطریں عالم علی خاں کے کردار پر لکھی ہے جس کا ذکر اجمالی جائزہ میں تفصیل سے لیا جائے گا۔

مولوی عبدالحق نے دکنی کے کئی مخطوطات کو پہلی بار متعارف کروایا اور انھیں اپنے مفید مقدموں سے شائع کیا۔ان ہی مخطوطات میں ایک اہم مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں ہے۔ یہ مثنوی مغل دور میں لکھی گئی۔ یہ ایک

رزمیہ مثنوی ہے جس میں آصف جاہ اول اور عالم علی خاں کی جنگ کی تفصیل ہے۔ اس مثنوی کے مرتب مولوی عبدالحق نے 1932ء میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ مثنوی کا مقدمہ صرف چار صفحات پر مشتمل ہے۔ مرتب کا فرض ہوتا ہے کہ مخطوطے میں موجود تمام نکات کا تفصیلی جائزہ لیں۔ مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''یہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں جو نام اور سنین آئے ہیں وہ تاریخ کے رو سے بالکل صحیح ہیں۔ مصنف کو عالم علی خاں سے ہمدردی معلوم ہوتی ہے اور وہ حق بجانب ہے۔ اس سن میں جس دلیری اور جیوٹ سے لڑ کر اس نے جان دی ہے وہ بے شبہ قابل تعریف ہے''۔(......)

اس میں کوئی شک نہیں جنگ نامہ عالم علی خاں ایک تاریخی مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں جن صوبیداروں کے نام، خطابات اور جنگ کی جو سنین پیش کی گئی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں، اس کی کئی وجوہات ہے جیسے پہلی وجہ

1- جنگ نامہ عالم علی خاں ایک رزمیہ مثنوی ہے جس میں نظام الملک آصف جاہ اول اور عالم علی جنگ کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہی آصف جاہ اول ہیں جو خواجہ میر عابد (خلیج خاں) (جو شاہ جہاں کے زمانے میں ہندوستان آئے اور جب شہزادہ اورنگ زیب صوبیدار ہوئے تو آپ بھی دکن چلے گئے) کے پوتے اور غازی الدین خاں (فیروز جنگ میر شہاب الدین) کے فرزند تھے۔ اور بعد میں 23 محرم 1137ھ ''اکٹوبر 1724ء کو دکن میں ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان کی تاریخ میں آصف جاہی حکومت سے مشہور ہے۔ عالم علی خاں، نورالدین علی خاں کا بیٹا اور سید عبداللہ (قطب الملک) اور سید حسین علی (امیر الامرا) کا بھتیجا جو 20 سال کی عمر میں چھ صوبوں کا صوبۂ دار مقرر کیا گیا تھا۔

2- دوسری یہ کہ مثنوی کی یعنی اندرونی شہادت سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ شاعر غضنفر کا تعلق مغلیہ سلطنت سے تھا اس جنگ میں عالم علی خاں کے ساتھ تھا اور شاعر کو عالم علی خاں سے ہمدردی بھی تھی۔ اس لئے مثنوی میں عالم علی خاں کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی اشعار لکھ دیئے ہیں جس کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

دسے کل پیاراں میں پیارا لگے　　　چلن چال اُس کا سونبارا لگے
جوانی میں ریش آغاز تھا　　　ننھی عمر میں صاحب راز تھا
بڑا قدر سے جوں برس تیس کا　　　ولے عمر تھا بیس اکیس کا

جنگ کو جانے کے لئے اپنی ماں سے اجازت لینے آتا ہے تو ماں اجازت دینے سے انکار کرتی ہے تو عالم علی خاں اپنی ماں سے کہتا ہے:

میں پوتا ہوں اس شیر مردان کا　　　ہوں فرزند نورالدین علی خاں کا
اگر ہے حیاتی تو پھر آویں گئے　　　فتح پاکے پھر موہ کوں دکھلائیں گے

جب نظام الملک کو سید عبداللہ خاں کا فرمان ملا کہ تم کو دکن کا صوبہ دار قرار دیا گیا ہے۔ تو نظام الملک عالم علی خاں کو یہ کہہ بھیجتے ہیں کہ مجھے دکن کا صوبہ دار بنا دیا گیا ہے۔ تمہارے ساتھ میرا لڑنا بے کار ہے اور میں لڑکے پر تلوار نہیں چلاتا۔ غضنفر حسین عالم علی خاں کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ننھی عمر ہے پن میں لڑکا نہیں　　　کسی بات کا دل میں دھڑکا نہیں
میں سید ہوں تم دل میں کیا لائے ہو　　　میرے ملک پر چلکے کیوں آئے ہو
مجھے عار ہے عار انکار ننگ　　　چلے آؤ بیگی نہ لاؤ درنگ
اگر لاکھ در لاکھ فوجاں ملیں　　　کہ جس طبق سب زمین کے ہلیں
میں وہ شخص ہوں جو ٹلن ہار نہیں　　　شجاعت میری کس پر اظہار نہیں
اگر ہے حیاتی تو غم نہیں مجھے　　　اگر موت ہے تو وہم نہیں مجھے
جو مارا ہے قسمت میں میرے قلم　　　نہو وے زیادہ و ناں ہووے کم
رضا پر میں راضی ہوں جو ہے رضا　　　وہی ہوئیگا جو کریگا خدا
میں راضی رضا پر ہو باندھا کمر　　　رکھا ہوں میں القصہ حق پر نظر
خدا کا کرم مصطفٰے کی پناہ　　　میں رکھتا ہوں اس بات پر سب نگاہ

3-اس مثنوی کی تیسری تاریخی اہمیت ماں کے وہ اشعار ہیں جب عالم علی خاں جنگ کو جانے کے لئے اپنی ماں سے اجازت لینے کو آتا ہے اور ماں اپنے بیٹے کو جس کی عمر صرف 20 سال کی ہے تو اس جنگ میں

جانے سے منع کر دیتی ہے۔ اور آخر میں جب عالم علی خاں اس جنگ میں بہادروں کی طرح لڑتا ہوا میدان میں شہید ہو جاتا ہے اس کی خبر جب عالم علی خاں کی ماں کو ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے کیوں کہ ایک ماں کی دلی تکلیف اور اپنے جوان بیٹے کو کھونے کا غم کیا ہوتا ہے صرف ایک ماں ہی جانتی ہے۔ جب ہم تاریخ کی دوسری مثنویوں پر نظر ڈالتے ہیں تو مرزا شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' میں بھی کچھ اس طرح کے اشعار نظر آتے ہیں۔ ''زہر عشق'' ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اور یہ ایک تخیل آمیز مثنوی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جبکہ ''جنگ نامہ عالم علی خاں''، مثنوی کا تعلق حقیقت سے ہے اور عالم علی خاں اور ماں کا کردار اور اُن کے مکالمے بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لئے یہاں پر مثنوی زہر عشق اور مثنوی ''جنگ نامہ عالم علی خاں'' کے ماں کے اُن اشعار کو پیش کیا جاتا ہے۔

(مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں)	(مثنوی زہر عشق)
کہی ماں نے فرزند میرے نونہال	کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو
ہوا دیکھنا مجکوں تیرا محال	کسی کی یہ کھا گئی نظر نم کو
کہاں ہے وہ فرزند عالم علی	دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں
تیرے دوکھ سوں سر پانوں لگ میں جلی	بیٹا! اس ماں کو کس پہ چھوڑ گئیں
فلک بے مہر نے کیا کیا ستم	تازہ بیدر جگر پہ داغ ہوا
گنوایا میری دھکدھکی کا بدم	گھر مرا آج بے چراغ ہوا
اوجالا میرے جیو کے ایوان کا	دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے
ستارا میرے ملک میدان کا	جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
میرے زیب زینت کا تھا گل گلاب	زہر دے دے کوئی میں کھا جاؤں
لڑا کر کیا سب چمن کوں خراب	یاز میں شق ہو ، میں سما جاؤں
ہوا عیش آرام میں کیا خلل	داغ نیرا ، جگر جلاتا ہے

عجب جیوتن سوں نجاوے نکل

ہزار آرزو اور ارمان سوں
میں پائی تھی عالم علی خاں کوں

کہاں اور کہاں اُس کی خانی گئی
سگل خاک میں اُس کی جوانی گئی

کہوں کیا جو پوچھینگے مجکوں نواب
کہاں ہے وہ فرزند مبارک نقاب

اپس ہات سوں کیوں گنوائی اُسے
ننھی عمر میں کیوں کٹائی اُسے

منانا کیسے کیوں تم اس بات سوں
گنوائی بہادر میرے ہات سوں

نہ کھاوے نہ پیوے روے زار زار
میرے جیو پیت بن یوں ہے بےقرار

پکڑ ہات کوں میں نکال تجھے
پھر آکر تو مکھ نہیں دکھایا مجھے

کہے تھے فتح پاکے گھر آئینگے
یو صورت نورانی کون دکھلائیں گے

کہ مہراں روپے بھر کے خیرات کی

چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے

مٹ گیا لطف زندگانی کا
دل کو غم ہے تری جوانی کا

بیاہ تیرا رچانے پائی نہ میں
کوئی منت بڑھانے پائی نہ میں

تیری صورت کے ہوگئی قربان
چلیں دنیا سے کیسی پر ارمان

ہوئیں کس بات پھر خفا ، بولو!
اما واری ، ذرا جواب تو دو!

بولتیں تم تہیں پکارے سے
اب جیوں گی میں کس سہارے سے

کیا قضا نے جگر پہ داغ دیا
آج گھر میرا بے چراغ کیا

نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارمان
ہائے بیٹا ، نہ تم چڑھیں پروان!

ایسی اس ماں سے ہوگئیں بیزار
لی نہ خدمت بھی ، پڑ کے کچھ بیمار

نہ جیوں گی نرے فراق میں میں

خبر کچھ نہ تھی مجکوں اس بات کی
دل تڑپتا ہے ، آنکھیں ڈھونڈتی ہیں

کہیں سدہ میں اولے کہیں سدہ گنوائے
کس مصیبت میں پڑگئی بیٹا!
نیناں سے انجھو ڈھال موتی بہائے
کوکھ میری اُجڑ گئی بیٹا!

ہوے خود کہی تلملا ہانک مار
عمر کٹنی تھی ایسے صدمے میں
اے حافظ! اے ناصر! اے پروردگار
ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

پکڑ ہات سونپی تھی یا رب تجھے
سن کے اس طرح اُس کی ماں کے بین
سبب کیا سو پھرنا دکھایا مجھے
اور سینے میں دل ہوا بے چین

تھی امید یہ دل میں دیدار کی
میرے فوج لشکر کے سردار کی

پھراوں کی خبراں میں خیرات کر
خبر کچھ نہ تھی مجھ کوں اس بات کی

ارے کوئی اس غم کی داور بتاؤ
مجھے اس عزاباں سوں بیگی چھڑاؤ

ہوئے بے شوش سو باریک بار بار
انکھیاں تے لہو روے وہ زار زار

گیان چند جین اپنی تصنیف ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں'' میں شوق کی مثنوی زہرِ عشق پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بیان ہی کچھ کم نہ تھا کہ شوق نے درد پر درد پیدا کرنے کو ماں کے بین نظم کر دیئے۔ ماں کے سامنے جوان اولاد کی موت سے

زیادہ جذباتی موقع کون سا ہوسکتا ہے''۔

تیری میت پہ ہوگئی میں نثار	کم سخن ہائے میرے غیرت دار
کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو	کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل پہ جو گزری کچھ بیان نہ کی	کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی
دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں	بیٹا اس ماں کو کس پہ چھوڑ گئیں
بیاہ تیرا رچانے پائی نہ میں	کوئی منت بڑھانے پائی نہ میں
ہوئیں کس بات پر خفا بولو	اماواری ذرا جواب تو دو
کس مصیبت میں پڑگئی بیٹا	کوکھ میری اُجڑ گئی بیٹا
عمر کٹنی تھی اپنی صدمے میں	ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

زہرِعشق کے آخری حصّے میں جوزہرِغم ہے وہ اُردو مثنوی میں اور کہیں نظر نہیں آتا''۔(......)

اس کے بعد سید محمد عقیل رضوی نے اپنی تصنیف ''اُردو مثنوی شمالی ہند'' میں زہرِعشق پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جنھوں نے مثنوی زہرِعشق کا بغور مطالعہ کیا ہے ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ رخصتی کی ملاقات ہی پوری مثنوی کی جان اور حاصل مثنوی ہے اس سے پہلے کا حصہ اور ماں کے بین کے بعد کا حصہ محض زیب داستان کے لئے بڑھایا گیا ہے۔صاف معلوم ہوتا ہے کہ کہانی کو طویل بنانے کے لئے یہ حصے جوڑے گئے ہیں''۔(............)

اس میں کوئی شک نہیں کہ زہرِعشق میں ماں کا بین صرف اور صرف مثنوی کو طویل بنانے کی غرض سے لکھا گئے ہیں۔ان دونوں اقتباسات سے ایک بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ گیان چند جین اور سید محمد عقیل رضوی کی نظر سے ''جنگ نامہ عالم علی خاں'' نہیں گزری۔

ڈاکٹر حبیب نثار نے اپنے ایک مضمون ''آئینہ ادب میں تاریخ کا مطالعہ'' میں ''جنگ نامہ عالم علی خاں''

کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آصف جاہ اول کی عالم علی خاں سے لڑی جانے والی جنگ کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔غضنفر نے اس جنگ سے متعلق ایک مثنوی ''سید عالم علی خاں'' لکھی ہے جس میں عالم علی خاں کی ڈیوڑھی میں جنگ کو روانہ ہونے کا موقع پر خواتین کو ہونے والی اُلجھن اور تشویش کا بیان بھی ملتا ہے۔خصوصاً عالم علی خاں کی ضعیف ماں کی التجا پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ اپنی تنہائی اور ضعیفی کی دہائی جنگ پر جانے والے اپنے نوجوان بیٹے کو دیتی ہے۔ عالم علی خاں جب ماں سے اجازت لیتے ہیں''۔(...........)

جب ہم ان اقتباسات کو مدنظر رکھ کر مرتبہ مثنوی ''جنگ نامہ عالم علی خاں'' کے مقدمے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں مقدمے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی ۔فاضل مرتب نے ماں کے بین پر صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ:

''بعضے اشعار مؤثر بھی ہیں خصوصاً جب عالم علی خاں ماں سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں اور رخصت ہوتے ہیں یا جب عالم علی خاں کے مرنے کی خبر آتی ہے اور ماں اس کا ماتم کرتی ہے''۔(...........)

ترتیب متن میں دوسرا اہم مرحلہ بنیادی نسخہ کا ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے نسخوں کے بارے میں مقدمے میں لکھتے ہیں:

''مجھے اس جنگ نامے کے تین نسخے دستیاب ہوئے۔ایک نسخہ میرا ذاتی ہے۔اسے (ا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ مجھے مولوی عبدالحمید صاحب وکیل کنٹر نے عنایت فرمایا جو (ب) سے موسوم ہے اور تیسرا وہ نسخہ ہے جو مسٹر ولیم آرون (William Iruine) نے مہاراجہ بنارس کے کتب خانہ سے حاصل کیا اور رسالہ انڈین اینٹی

کیوری (Indian Antiquary) بابت ماہ جنوری و مارچ سنہ 1904ء میں مع انگریزی ترجمے کے شائع کیا۔ یہ نسخہ (ج) ہے"۔(......)

مرتب مولوی عبدالحق نے مقدمے میں تین نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ (ا) یعنی اُن کا ذاتی نسخہ، (ب) والا نسخہ جس کو مولوی عبدالحمید صاحب وکیل کنڑ نے عنایت فرمایا تھا اور تیسرا نسخہ (ج) جس کو مسٹر ولیم نے مہاراجہ بنارس کے کتب خانے سے حاصل کر کے 1904ء میں مع انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ مگر مولوی عبدالحق نے اِن تینوں کی کوئی تفصیل مقدمے میں نہیں پیش کی۔ صرف اتنا ہی لکھا ہے:

"مسٹر آرون کا نسخہ اول و آخر سے ناقص ہے۔ عبدالحمید صاحب کے نسخے میں شروع کے کچھ اشعار غائب ہیں۔ میرا نسخہ مکمل ہے اور اس کی ترتیب اور تحریر دوسرے نسخوں سے بہتر ہے۔ اس لئے میں نے اس نسخے کو بنیاد قرار دیا ہے۔ البتہ دو ایک جگہ ایک ایک مصرع غائب ہے اور بعض مقامات پر کوئی کوئی لفظ رہ گیا ہے۔ کہیں کہیں مصرع پورا کرنے کے لئے قیاس سے جو لفظ بڑھا دیئے ہیں انھیں قوسین میں لکھ دیا ہے"۔(......)

مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ مسٹر آرون کا نسخہ (ج) ناقص اوّل و ناقص آخر ہے اور عبدالحمید صاحب کا نسخہ (ب) میں شروع کے کچھ اشعار غائب ہیں۔ جب ہم اس اقتباس کو مدنظر رکھ کر مطبوعہ مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں کا مطالعہ کرتے ہیں تو مولوی عبدالحق تذبذب کا شکار معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ مطبوعہ مثنوی کی ابتداء میں یہ نوٹ لکھا ہوا ملتا ہے۔

نوٹ: "شروع کے بیس شعر نسخہ (ب) سے لئے گئے ہیں۔ نسخہ (ا) میں موجود نہیں، نسخہ (ج) میں بھی ابتدائی حصہ غائب ہے اور 44 ویں شعر سے شروع ہوتا ہے"۔(......)

مولوی عبدالحق مقدمے میں اپنے طریقہ کار، اختلاف نسخ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی ظاہر کر دیا

ہے۔تینوں نسخوں میں اشعار کی کمی بیشی بھی پائی جاتی ہے جو اشعار نسخہ (ا) میں نہیں اور دوسرے نسخوں سے اضافہ کئے گئے ہیں، ان پر علامت 'X' لگا دی گئی ہے۔اور جن اشعار پر یہ 'X' نشان ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوسرے نسخوں میں نہیں ہیں''۔(......)

جب ہم اس اقتباس کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُلجھن کا شکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ مرتب نے اختلاف نسخ درج کرنے کی علامت میں اُلجھن پیدا کردی ہے۔مرتب مولوی عبدالحق نے ایک ہی X (علامت) کی نشاندہی مقدمے میں کی ہے اور متن میں دو علامتیں ملتے ہیں۔ایک علامت 'X' اور دوسری علامت 'X' ہے۔ یعنی 'X' علامت، جن اشعار کے سامنے یہ علامت ہے۔یہ اشعار مولوی عبدالحق کا ذاتی نسخہ (ا) میں نہیں ہے۔ یہ اشعار نسخہ 'ب' اور نسخہ (ج) میں موجود ہیں۔دوسری علامت 'X' ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اشعار صرف اور صرف فاضل مرتب کے ذاتی نسخہ (ا) میں موجود ہیں۔مولوی عبدالحق نے مقدمے میں دو علامتوں کو ظاہر کرنے کے بجائے صرف ایک ہی علامت کو دوبارہ لکھ دیا ہے جس کی وجہ سے اُلجھن پیدا ہوگئی ہے۔

فاضل مرتب نے مثنوی ''جنگ نامہ عالم علی خاں'' کا خلاصہ نہیں دیا ہے۔مثنوی کا خلاصہ یہ ہے۔

مثنوی کا خلاصہ:

مثنوی کی ابتداء میں حمد، نعت اور منقبت کے اشعار لکھے ہیں۔قصّہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ عالم علی خاں دکن کے چھ صوبوں کا صوبہ دار تھا۔وہ نہایت ہی سیدھا سادھا، جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ابتدائی جوانی، بیس، اکیس کا سن تھا۔پر حلیہ کے لحاظ سے تیس برس کا معلوم ہوتا ہے۔ہر طرف امن و امان پھیلا ہوا تھا۔اچانک یہ غل اور ہنگامہ برپا ہوا نظام الملک کی فوج دکن کی جانب پیش قدمی کر رہی ہے اور کوئی آکر یہ خبر دیتا ہے کہ نظام الملک نربدا پر پڑاؤ ڈال دیا تو محل میں جنگ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔سب لوگ بزرگانِ دین پر نذریں چڑھانے لگے اور اللہ تعالیٰ، سے دعائیں مانگنے کہ ہم پر یہ جو مشکل آپڑی ہے اس کو آسان کردو اور مشکل کو دور کردو۔

ادھر محل میں جنگ کی خبر سن کر دوسری مثنویوں کی طرح نجومیوں اور فقیروں کو محل میں طلب کیا گیا اور ان سے مشورہ کیا گیا۔نجومیوں نے جنگ میں فتح ہونے کی خبر دی۔ یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئے۔مگر فقیروں نے

کہا کہ آپ شہر چھوڑ کر باہر نہیں جانا کیوں کہ آپ کی جان کو دھوکہ ہے اور آپ کی فوج ہی آپ کو دھوکہ دینے والی ہے۔ اُس پر عالم علی خاں کہتا ہے کہ مرنا، جینا تو رب کے ہاتھوں میں ہے اور آگے کہتا ہے جو مجھے دھوکہ دے گا وہ بہت پچھتائے گا۔ عالم علی خاں کا جواب سن کر فقیروں نے کہا کہ جو بھی کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرو اور ہماری نصیحت کو مت بھولو۔

عالم علی خاں اپنی ماں کے پاس جنگ کے لئے جانے کی اجازت لینے گیا تو ماں اِس بات پر راضی نہیں ہوئی تو عالم علی خاں کہتا ہے کہ دنیا میں ہمارا نام ہے اور میں نورالدین علی خاں کا بیٹا ہوں۔ نہیں تو قطب الملک اور نظام الملک یہ سن کر تعجب کریں گے کہ نورالدین کا بیٹا ڈرپوک ہے اور اس میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ میں جنگ کے لئے جاؤں گا ضرور اور حیات رہی تو ضرور واپس ہوں گا، تم پریشان مت ہو، اللہ تعالیٰ سے اچھی اُمید رکھو۔

ماں کہتی ہے کہ تیرے جیسا بہادر پورے دکن میں نہیں اور پھر کہتی ہے کہ تیرے ساتھ کوئی بھی اپنا نہیں اس لئے میں تیرے ساتھ آؤں گی۔ عالم علی خاں کسی طرح ماں کو منع کر یہیں پر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ عالم علی خاں کے ساتھ چالیس ہزار فوج جس میں پنجارے، قصائی، سبزی فروش، دھوبی، حجام، لوہار تھے اور سب جنگ فتح کے نقارے بجاتے روپئے اشرفیاں لٹاتے چلے گئے۔ تب عالم علی خاں تمام سپاہیوں اور سرداروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ہند کیا اور دکن کیا، میں کہاں سے کہاں آیا ہوں، مجھے یہاں میری قسمت لے کر آئی ہے اور آگے کہتا ہے کہ مجھے جینے اور مرنے کی کوئی فکر نہیں، اور نہ ہی تخت و تاج کی۔ جنگ میں کامیابی حاصل کرنا یہ مردوں کی بہادری کا ثبوت ہے اور فتح حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ جو آیا ہے وہ واپس لوٹ جائے اور شہر کے باہر ڈیرے ڈالے گئے۔

ادھر عالم علی خاں کی ماں بیٹے سے ملنے کے لئے تڑپنے لگی اور شہر کے باہر چلی گئی اور بیٹے کو گلے سے لگا کر رونے لگی۔ تب عالم علی خاں اپنی ماں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ماں تم پریشان مت ہو۔ اور جنگ ختم ہونے پر پھر واپس بھی تو آؤں گا۔ تم اتنا بے قرار مت ہو اور شہر کی طرف لوٹ جاؤ۔ عالم علی خاں کا یہ جواب سن کر ماں کہتی ہے کہ میں کیا کروں مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ ایک ایک دن مجھے ایک ایک سال کا لگتا ہے۔ میرا حال صرف خدا جانتا ہے۔ نصیب میں کیا ہے میں نہیں جانتی، اب زندگی مجھے زہر لگتی ہے اور پھر اپنے قدیم

سپاہیوں کو جس میں لطیف خاں، عمر خاں، محمدی بیگ، اومٹھے خاں اور زاہد خاں کو بلاتی ہے اور انھیں چاندی کی تار میں بنے ہوئے کپڑے اور اشرفیاں دیتی ہے اور قسم دلاتی ہوئی کہتی ہے کہ تمہیں اپنے نمک کا واسطہ میرے بیٹے کے ساتھ وفادار رہو۔ تمام سپاہی عالم علی خاں کی ماں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم ہر قدم پر اُن کے ساتھ رہیں گے اور اُن کے ایک قطرے خون کے بدلے ہم اپنا سارا خون بہا دیں گے۔

مثنوی کا یہ حصہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہ مثنوی تاریخی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس میں ماں اور عالم علی خاں کے جو مکالمے ہیں اس کی مثال دوسری مثنویوں میں کہیں نہیں ملتی۔ مثنوی کا یہ حصہ قاری کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور قاری کو عالم علی خاں سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔

ادھر نظام الملک کو جب جنگ پر یقین ہوا تو وہ عالم علی خاں کو سلام بھیجا اور یہ کہلوا بھیجا کہ اس جنگ میں کیا رکھا ہے اور تجھے اِس جنگ سے کیا فائدہ۔ مجھے دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور میں چھوٹے لڑکے پر تلوار نہیں چلا سکتا۔ جب یہ بات عالم علی خاں سنتا ہے تو کہتا ہے کہ میری عمر چھوٹی صحیح لیکن میں لڑکا نہیں اور مجھے تلوار چلاتے وقت ڈر بھی نہیں لگتا اور آگے کہتا ہے کہ میں سید ہوں اور تم میرے ملک میں سے چلے جاؤ۔ میری بہادری کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ اگر زندگی ہے تو غم نہیں ہے اور موت ہے تو کوئی وہم نہیں۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا میں، میں راضی ہوں جو بھی ہو سب اللہ کی مرضی سے ہوگا۔ یہ کہہ کر عالم علی خاں اپنے لشکر کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ دونوں طرف کے لشکر پڑاؤ ڈال دیئے۔ اللہ کی مہربانی دیکھئے کہ کئی دن تک صبح و شام بارش ہونے لگی۔ ایک رات اچانک یہ خبر ملی کہ صبح جنگ ہونے والی ہے۔ اور کسی نے کہا کہ ہمارے کچھ جاسوس اور قاصد نظام الملک کے غلام ہو گئے ہیں۔ اُس دن عالم علی خاں نے جب یہ سنا تو کہا کہ ہمارے تمام لوگ وفادار ہیں اور ہمیں دھوکہ نہیں دیں گے۔ دوسرے دن صبح ہوئی تو عباس خاں نے کہا کہ آج جنگ ہے۔ اُس دن شوال کی 6 تاریخ اور اتوار کا دن تھا۔ ایک جاسوس پسینے میں ڈوبا ہوا بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ نظام الملک فوج لے کر آیا اور نقارہ بجا رہا ہے۔ عالم علی خاں یہ خبر سن کر اُٹھا اور کہا کہ میری کٹاری، نیزہ، شمشیر، ترکش منگاؤ گھوڑوں کو تیار کرو، میرا بانک، خنجر لاؤ، میری پالکی کو جھالر لگاؤ، میرے ہاتھی کو صندل لگاؤ۔ اسی وقت عالم علی خاں نے پانی نہا کر دونوں ہاتھ اُٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگا کہا کہ یا نبی سرور کائنات میری عزت رکھ اور میری مدد کر۔ یہ کہہ کر اپنا لشکر لے کر آگے بڑھا تو زمین کانپنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین دھنس جائے گی اور آسمان کانپ اُٹھے گا۔

جوش میں آنکھیں لال ہونے لگیں۔لڑوں یا مروں کا جوش تھا۔ عالم علی خاں نے اپنے تمام سرداروں غالب خاں، سلیم خاں، مٹھے خاں، دلیل خاں اور امین خاں سے کہا کہ ساتھ حصے بناؤ اور امین خاں کو کہا کہ تم ان سب کے سردار ہو۔تم سیدھی طرف چلو، تمہارا کوئی ثانی نہیں۔ امین خاں نے کہا کہ بے شک میں لڑوں گا لیکن تمام فوج مجھے اکیلے پر آئی تو میں کیا کروں گا۔ عالم علی خاں کہنے لگا کہ وہی ہوگا جو رب چاہتا ہے اور آگے کہتا ہے کہ ڈرومت تم اکیلے نہیں ہو، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں، تمہاری ہار، ہم سب کی ہار ہوگی۔ دنیا میں دوبارہ آنا نہیں ہے۔ یہ دنیا ہمیشہ کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ اگر شرم ہے تو لڑ کر مرو، نہیں تو زہر کھا کے مرو، خبردار ڈرومت اگر زندہ رہنا ہے تو خوب تلوار چلاؤ۔

جنگ شروع ہوگئی، تیریں، تلواریں چلنے لگیں۔ نظام الملک کی جیت ہونے لگی۔ باجے بجنے لگے۔ کوئی مشرق کی طرف کوئی مغرب کی طرف، کوئی شمال تو کوئی جنوب کی طرف چلانے لگے اور فتح ہے فتح ہے کی آواز بلند ہونے لگی۔ تب عالم علی خاں نے غالب خاں کو بلایا اور کہنے لگا کہ اب ہمیں مرنا ہے اور یہی ہماری تقدیر ہے۔ اس کو کوئی نہیں مٹا سکتا پھر جنگ شروع ہوگئی اور تیور خاں کو توپ کا گولا لگا۔ اس کے ہاتھ سے مورچھل چھوٹ کر گر گیا۔

ادھر عالم علی خاں کو تیر لگا جو گالوں کو چیر دیا۔ اُس نے تیر کو زور لگا کر کھینچ دیا اور موڑ کر پھینک دیا۔ اس کو تیروں پر تیر لگے پھر قریب آ کر ایک فوجی نے پیشانی پر تیر چلائی، پھر کسی نے اس پر بھالے سے وار کیا۔ تیر پر تیر اتنے لگے کہ بے ہوش ہوگیا۔ اتنے میں ایک تلوار کا وار پڑا تمام عزیز چھوڑ کر نکل گئے۔ لہو سے پورا جسم لال ہوگیا۔ اتنے میں نظام الملک کے تمام سپاہی اس پر گھیرا ڈال دیا۔ عالم علی خاں نے ہار نہیں مانی۔ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلانے لگا، کربلا کے میدان کو پھر تازہ کر دیا۔ پانی کی پیاس سے حلق سوکھنے لگا، وہاں نہ پانی تھا نہ پانی پلانے والا۔ اسی عالم میں وہ لڑنے لگا۔ آنکھوں پر لہو بہہ رہا تھا۔ لہو پوچھتے پوچھتے اسی طرح لڑنے لگا۔ اتنے وار ہوئے کہ جسم پر چھتیس تیر جس سے فوارے کی طرح خون اچھلنے لگا۔ توپ کا گولا لگا، اس کی گردن ڈھل گئی، اسی پر بھی خنجر آلگا اور اس نے پھر اپنا دم توڑ دیا۔ سپاہیوں نے افسوس سے اسے اُٹھایا، جب شوال کی ۶ تاریخ بڑی منحوس تاریخ تھی۔

جب شہر میں یہ خبر پھیلی تو سارا شہر غمگین ہوگیا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ عالم علی خاں کی ماں افسوس سے

کہنے لگی اب میرے لئے کچھ نہیں بچا، زمین سخت ہوئی اور آسمان دور ہو گیا۔ میرا کھانا پانی سب حرام ہو گیا، تجھے اس حالت میں، میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس نے میری زندگی کو اندھیرا کر دیا۔ میرے عیش و آرام، میری آرزو، میرے ارمان سب تجھ سے تھے، تجھ کو میں نے ہزاروں آرزو اور آرمان سے پالا تھا۔ تو نے چھوٹی سی عمر میں اپنی زندگی گنوادی۔ بھوکی پیاسی اس طرح روئے جارہی تھی اور روتے ہوئے کہتی ہے کہ تو نے کہا تھا کہ فتح حاصل کرے گا اور اپنی نورانی صورت دکھائے گا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی کہ تو اس حال میں آئے گا، رورو کے بے ہوش ہونے لگی۔ محل کے تمام لوگ غمگین تھے۔ ان کی داد وفریاد کوئی سننے والا نہیں تھا۔

عالم علی خاں کے انتقال کے بعد اُس کی ماں اور تمام اہل وعیال دولت آباد چلے گئے۔ عالم علی خاں کا جو شہر تھا ویران ہو گیا، ہزاروں سپاہی، ہزاروں غلام، ہزاروں گھوڑے، بے شمار ہتھیار، سارا مال اسباب لُٹ گیا۔ اب کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ کچھ کہہ سکے۔ اب یہاں پرندے کو پَر مارنے کی بھی جرأت نہیں تی، زندگی ایک قید کی طرح ہوگئی۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ ہر طرف پھول ہی پھول کھلے رہتے تھے، نقارے بجتے تھے، اے اللہ یہ ایک ہی پل میں کیا سے کیا ہو گیا۔ جنگ کے میدان میں چھوٹی سی عمر میں یوں بے حال پڑا ہے۔ ہزار افسوس کہ وہ دنیا سے چلا گیا۔

شاعر نے آخر میں نصیحت آمیز اشعار لکھے ہیں۔ کہتے ہیں: ایک دن سب کو خاک میں سونا ہے، چاہئے وہ بادشاہ ہو یا فقیر سب کو وہاں حساب دینا ہے۔ مال و دولت سب چھوڑ کر جانا ہے، وہاں نہ ماں، باپ آئیں گے نہ دوست واحباب، دنیا میں سب مہمان کی طرح ہیں۔ شیر اور چیتے جیسے بہادر سب خاک میں مل جائیں گے۔

شاعر نے اپنا نام اور سنہ تصنیف بھی لکھ دیا ہے۔ ہزار اور سو تیس تھی اور دواُوپر یعنی 1132ھ محمد پر درود و سلام، یہ قصہ غضنفر حسین نے لکھا ہے اور یہ دنیا اسی طرح چلتی رہے گی۔

آئندہ صفحات میں مولوی عبدالحق کے مرتبہ جنگ نامہ عالم علی خاں اور اسی مثنوی کے مخطوطہ ادارہ ادبیات اُردو کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ صفحہ کے سیدھے جانب مولوی عبدالحق کا مرتبہ متن درج کیا گیا ہے اور پھر مخطوطہ ادارہ ادبیات کا اختلافی متن درج کیا جارہا ہے۔

نسخہ مولوی عبدالحق نسخہ ادارہ ادبیات اُردو

اول حمد واجب ہے کرتار کا
دو عالم کے وارث خریدار کا

قضا اور قدر جس کے ہے ہاتھ میں
نہیں شک شبہ کچھ کسی بات میں

حکم بات اوس کے ہے حاکم ہے وہ
سگل عیش و عشرت کا عالم ہے وہ

نرنجن ترا دھار مہربان ہے
خداوند برحق مہربان ہے

ہے خاوند قدرت کا قادر ہے وہ
نہیں دور ہر حال حاضر ہے وہ

کہ دیدے سرو پا سے جلوہ ......
دبوے راج سر پر رکھے تاج سر

اچھے کس کوں حافظ رکھے برقرار
خطا بخش مہربان پروردگار

خرابی میں جس کے اشارہ کرے
اُسے ایک پل میں اوارہ کرے

کرے لطف کی جس کے اوپر نظر
دیوے راج سر پر پھر اوے چھتر

کرے ملک سب اس کی تسخیر میں

اول حمد حق کر بدل ابتداء
بخواں بعد نعت رسول خدا

کرم گستر لطف ہے کارساز
خداوند عالم ہے دانائے راز

گلستاں کہا اک کون بر خلیل
جہاں آفرین حق ہے اب الجلیل

کیا چرخ کو ہے کھڑے بے ستون
تعالی اللہ قیوم ہے کیا کہوں

فلک کو کیا روشن انجم سے ہے
زمین کو دیا زیب مردم سے ہے

اب حمد خدا بس تو مرحوم کر
ہر یک اُس کی حکمت کو معلوم کر

کہو ٹک ہر یک دم تو لغت نبیؑ
کریں یوم دیں تا شفاعت تیری

شفیع انور مقبل ......
رسول خدا خاتم الانبیاء

عزیز وہی ختم رسالت رسول
کیا جس پہ قرآن ہے نزول

نہیں مالک ہر دوسرا مصطفیٰ

گھمادے حکمت کی زنجیریں
امام رُسل ہے امام الہدیٰ

رکھے عمر دولت کا روشن چراغ
کرے دل کوں ہرغم سوں اُس کے داغ

تو نعت پیمبر کو اب کر ختم
کریں کا کیاں تک کہو تو رقم

رکھے رنگ قدرت کا انسان میں
مکرم کیا اس کوں جس شان ہیں

کرے لطف کے اپنی جس پر نظر
دیوے راج سر پر دھر اوپر چتر

جو کچھ کھیل کھیلے سزاوار ہے
مزاحم نکوی اس کا اظہار ہے

کرے فلک سب اُس کی تسخیر میں
کٹاویں حکومت کی زنجیر میں

کیا کس کے کہتے ہیں سارا ظہور
کفر ھور اسلام ظلمات نور

اکیس عمر دولت کا روشن چراغ
کرے دل کوں ہرغموں اُس کی فراغ

جو واقف ہے وحدت کے میدان کا
ہے غالب دو عالم کے میدان کا

لحانی منگے جس کی ایمان کوں
مسلط کرے نفس شیطان کوں

لیجانے لگے جس کے ایمان کوں
مسلط کرے نفس شیطان کوں

سٹے تا ابد اُس کوں گمراہ کر
سعادت کی راہ پاتی ہے راہ کر

رکھے تا ابد اوس کوں گمراہ کر
سعادت کے راسوں بیراہ کر

اچھے بے خبر حق سون ہر حال میں
کر فنا دنیاں کی جنجال میں

اچھے بے خبر حق کسوں بد حال میں
گرفتارہ نیا میں جنجال میں

نجانے خدا کوں نجانے رسول
کرے عاقبت اپنی سب خاک دھول

نجانے خدا کوں نجانے رسول ......
کرے عاقبت اپنی سب خاک دھول

جب ہے خبر اُس کوں محرم کتے
دنیاں کی محبت سوں بے کم کتے

اُسے ہے خبر جس کوں محرم کیا
دنیا کی محبت سوں بے غم کیا

ود و گھر شیران کوں سر کھاے ہیں
اتک اس کے بھاند میں پچھتائے ہیں

غنیمت سمجھ عمر کیا شور ہے
انکھیاں کھول کر دیکھ انگے گور ہے

یو دھن مال آخر کوں رہ جائیگا
جو کچھ یہاں کیا ہے سو وا پائیگا

جو واقف ہے دو جگ کے میداں کا
دو عالم میں اوہی یہ پری شان کا

غنیمت سمجھ عمر کیا شور ہے
انکھیاں کھول کر دیکھ انگے گور ہے

یو دہن مال آخر کوہ رہ جائیگا
جو کچھ یہاں کیا ہے سو وہاں پائیگا

درنعت محمد مصطفیٰ علیہ السلام

محمد نبی پر درود اور سلام
جتنے اہل اصحاب سب پر سلام

شفیع ہے خلائق کے کردار کا
مقرب خدا کے سو دربار کا

اول ہیں ابابکر روشن ہلال
صدق اور بزرگی میں ہیں بے مثال

دوجے ہیں عمر یار صاحب وقار
کہ دائم نبی سوں رہے یار غار

تیجے یار عثماں اہل جناں
جنو کیا جمع سارا قرآن

محمد نبی پر درود و سلام
جتنے آل و اصحاب پرتت مدام

شفیع ہے خلائق کے کردار کا
مقرب خدا کے سو دربار کا

سنو اس حکایت کا کیا ہے بیاں
سنو جہاد دلیرتے ......

قصّا نہیں قبا منکا آثار ہے
سنیا ہوں یو جب سبھی اظہار

(یہ شعر مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے)

کہ چوتھے تعلیٰ شاہ داول سوار
جنو نے کی کمر میں رہی ذوالفقار

سبھی چار یاراں میں اہل قدر
حشر کے ہیں مسند کے صاحب صدر

زہے پنجتن ہیں خدا کے ولی
ہراں سو ہوا دین روشن جلی

کہا یوں حکایت غنیمت بیاں
سنو جاں دل سے ہمیں بے گماں

نعت کی سرخی آصفیہ نسخے میں نہیں ملتی اور یہ اشعار بھی آصفیہ نسخے میں موجود نہیں ہیں۔ یہ نعت کے اشعار نہیں بلکہ منقبت کے اشعار ہیں۔ نعت کی سرخی بھی مولوی عبدالحق کا ہی اضافہ ہوسکتا ہے۔

قضا نے سو ہر حال آخر زماں
کہے ہیں نبی سوچ دستا عیاں
اس شعر کے بعد مطبوعہ نسخہ میں یہ شعر لکھا ہوا ملتا ہے۔

قضا نیں ہے جو ہول آخر زماں
کہتے ہیں نبی سو ہوا ہے عیاں
جب کہ آصفیہ نسخہ میں اس شعر کے بعد یہ شعر لکھا ہوا ملتا ہے۔

عزیزاں جو سب پیچ در پیچ ہے
یو قصہ عجب پیچ در پیچ ہے

سنو ابتداء دوستاں جنگ کا
زمانے کی گردش اور نیرنگ کا

نپٹ خوب صورت و صاحب جمال
کہ دنیاں میں کوئی نہیں اس کی مثال

نپٹ خوب صورت و صاحب جمال
کہ ثانی نہ تھا کوئی اُس کی مثال

دسے کل پیاراں میں پیارا لگے
چلن چال اُس کا سو نیارا لگے

سگل جگ کی پیاریاں میں پیارا اُسے
چلن چال نکلیاں سوں نیارا دسے

رہے سب سوں ہل مل کے آرام سوں
نہیں کام کچھ صبح اور شام سبوں

رہے سب ہل مل کے آرام سوں
نہ مطلب ہے کس سوں نہ کس نام سوں

دعایاں اسم میں پڑھانے لگے
کہ نذراں بزرگاں چڑھانے لگے

کہ نظراں جہاں ثانی چھڑانے لگے
دعایاں اسم تب پڑانے لگے

ہتی ہور گھوڑے تصدیق دے
جو کچھ زماں تھا یو سب کچھ کئے

ہتی ، اونٹ ، گھوڑے تصدق کئے
جو کچھ جگ میں کرنا سو سب کئے

تصدق دعایاں اتارن لگے
روپے اشرفیاں اتارن لگے

تصدق اتارے اوتاران لگے
روپا اشرفیاں اونارن لگے

جہاں لگ جو کوئی صاحب ہوش تھے
زمانے کی گردش کے سر پوش تھے

جہاں تلک قطب غوث اور پیر تھے
جہاں لک ولی خاص گمبھیر تھے

مطبوعہ نسخہ میں اس شعر کے بعد یہ شعر ملتا ہے۔

جبکہ نسخہ آصفیہ میں اِس شعر کے یہ اشعار ملتے ہیں۔

جہاں لگ مقرب تھے درگار کے
جہاں لگ ولی خاص اُس راہ کے

جہاں تلک معرب تھے درگار کے
جہاں لگ جو تھے خاص اُس راہ کے

جہاں لگ جو کوئی صاحب ہوش تھے
زمانے کی آفت کی سرپوش تھے

مدد مانگ سب سوں کہتا سوال

جہاں لگ قلندر تھے اہل کمال

جہاں لگ قلندر تھے اہل کمال
مدد مانگ نکلیاں سوں کیتا سوال

بلا پھر نجومی کھلایا نجوم
کہہ غلغہ کیا ہے کیا دھام دھوم

بلا پھر نجومی کہو لائے نجوم
کہو کیا ہے یہ غلغہ یہ کیا ہے ہجوم

وہ آیا ہے کیوں کس طرف چال ہے
کہو عاقبت کوں سو کیا حال ہے

ہے غالب ہمنا پریا مغلوب ہے
سنا دوشنابی جو کچھ خوب ہے

یہ دونوں شعر نسخۂ آصفیہ میں نہیں ہیں

نہ امراو کوئی صاحب فوج ہے
سپاہی نہ کوئی صاحب اوج ہے

نہ امراؤ کوئی صاحب فوج ہے
شتابی نہ کرنے میں لئے یوج ہے

اٹھے بول یاراں سبھی اور شاہ
یو کیا باب ہے تمنا بوجھو صلاح

اٹھے بول یاراں کہ شاہد خدا
بو کہا کام ہے ہم نہ یویں چلا

اچھیں خیر خاہی میں مستقیم
اسے بس کفایت کرے گا غنیم

سکت کیا جو کوئی روبرو ہوسکے
زمین چھانڈ کے کوئی نہ ہرگز ٹلے

سکت کا جو کوئی روبرو

کہ یو فوج ہے آج دشمن سکن
اگر ہوئے جمع ہو سارا دکھن

یہی اور فوج ہے فوج دشمن شکن
اگر ہوئے جمع ہند اور سب دکھن

لڑیگا ووہی مرد میدان میں
شجاعت ہے جس مرد کی شان میں

قدیموں کی اپنے کرو دلبری
یو ہے بات بھاری نہیں سرسری

یہ تینوں شعر نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے۔

رہے ہو کے تم شاہ اندیشہ ناک
تمہارا ہے حافظ وواب ذاتِ پاک

یوں در دل میں مت لاؤ اس بات کا
بھروسہ ہمن کوں ہے اس ساز کا

فتح ہے فتح پر فتح کار ہے
عزیزاں تمہارا خدا یار ہے

مجھے عار ہے عار انکار ہے
کہ تحقیق مرنا سزاوار ہے

کروں گا جو کچھ مجھ سوں ہواوئے گا
یہی نام مردوں کا رہ جائے گا

نگاہ داشت کی خوب کرنی کئے
نکلنے کی بیگی اوتاولی کئے

کسب چھوڑ بہوتوں نے گھوڑے لئے
سپر بانک بہوتوں نے تو رُے لئے

رہے شاہ جب ہوکے اندیش ناک
تمہارا ہے حافظ اور ساداتِ پاک

بولا دل میں مت لیاؤ اس بات سوں
بھروسا ہے ہم کوں سو اس بات سور

فتح ہی فتح پن بڑا مار ہے
عزیزاں تمہارا خدا یار ہے

مجھے عار ہے عار انکار ہے
کہ تحقیق مرنا سویک بار ہے

کروں گا جو کچھ مجھ سوں ہوا وئے گا
یہی ناوں دنیاں میں رہ جائے گا

اندیشہ سوں کل دل کو خالی کرو
نکلنے کی بیگی تیاری کرو

یونہی دیکھنے کے لڑن ہار نہیں
یو ہے مار کا سخت بیوپار نہیں

کرو گے جو کچھ سو سمجھ کر کرو
ہماری نصیحت جو دل میں دھرو

یہ تینوں شعر نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے۔

کہ تم ماں میں فرزند بڑے مان کا
بڑے پیار ہوا بڑے ماں کا

کہ تم ماں میں فرزند ہوں پریدر کا
بڑے ماں کا ہور برے بیار کا

نظام الملک کی خبر ہے گرم
نہیں اب تو رہتی نہ دستی شرم

میں ہوتا ہوں اس شیر مردان کا
ہوں فرزند نورالدین علی خاں کا

میں ہوتا ہوں اس شاہ یزداں کا
ہوں فرزند نورالدین علی خاں

مجھے بیٹھنا شہر میں تنگ ہے
اگر آج رستم ستی جنگ ہے

مجھے مست رہنا پہ اتنگ ہے
اگر آج رستم ستی جنگ ہے

یوسن کے کہیں گے سو قطب الملک
دکن میں گیا تھا نظام الملک

حسین کے مجھ اوپر قطب الملک
دکھن میں گیا تھا نظام الملک

اگر ہے حیاتی تو پھر آویں گے
فتح پاکے پھر موہ کوں دکھلائیں گے

اگر ہے حیاتی تو پھر آئیں گے
فتح ہے تو موں آکے دکھلائیں گے

اپس دل میں ہمنا ساروں کا

اپس دل سے ہمنا اوتاروں نکو

دعا میں اچھو ، نت بسارونکو

لبھاتا بڑا کوئی نہیں سات ہے
تو لڑنے کوں جانا یو گھات ہے

قسم ہے تجھے تجھے سیر تو اب کا
ہے سوگند تجھے میرے ماں باپ کا

میرے دل منے وہم وسواس ہے
میرے اس ....

مجھے چھوڑتوں جا اکیلا نکو
یوجانے کا دل میں فکر نا کرو

میری ننگ و ناموس اور راج کا
کیا ہے قسم تجھ کوں معراج کا

تیرا ملک تجھ کوں مبارک اچھو
مدد تجھ کوں ...... مبارک اچھو

(یہ پانچ اشعار نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے۔)

چھ سوار اُس وقت سید کے پاس
سپاہی قدیم تھے وگھر کے خواص

بلائے شتابی سوں دیوان کوں
کہا تم لکھو خط علی خاں کوں

دعا میں اچھو ، نت بساروں نکو

نبھناتا بڑا کوئی تیرے سات نہیں
تو جاتا ہے لڑنے کہوں کیا سو نہیں

چھ سو سوار اُس وقت حاضر تھے پاس
سپاہی ومیلے ، سگل عام و خاص

بولائی شتابی سوں دیوان کوں
لکھو خط میں اب امین خاں کوں

(مطبوعہ نسخہ)

زرہ بکتراں پاک کرنے لگے
جہاں کے تھاں خوب مرنے لگے

کمانا وترکش منگا بے شمار
لگے باٹنے فوج میں ایک بار

شہر میں ڈھنڈورا پھرایا تمام
جہاں لگ سپاہی اچھے نیک نام

پنجارے ، قصائی و سبزی فروش
اتھے دیکھ دل میں ہوا سب کوں خوش

کہ کنجڑے ، بھٹارے و دھوبی ، حجام
بھڑائی ، بہشتی ، بہار کئے اسلام

کمر باندھ ٹٹو پر اسوار ہو
بے بغل بند ھات دھو

(یہ اشعار نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے۔)

اٹھا یاوویں ماہ رجب کا چاند
جلیا کھڑے شمتیر یکتر کوں یاند

یہ شعر مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے۔

دسے یوں سردار ساراں منے
دسے چاند سارا ستاراں منے

دسے یوں و سردار ساریاں منے
کہ جیوں چاند ہے کل ستاریاں منے

کہا جاکے ڈیرا دیو میدان میں
محمدی باغ کے خوب او جان میں

(مطبوعہ نسخہ میں اس کے یہ اشعار ہیں۔)

نقارے دمامے بجاتے چلے
روپے اشرفیاں لٹاتے چلے

دسے بو سردار سارا منے
دسے چاند سارا ستاراں منے

کہا جائے ڈیرے میں وو دو مقام
کرے ملک تدبیر ہر صبح و شام

جہاں لگ تھے نوکر سپاہی امیر
بلاکر کہئے خان روشن ضمیر

اس شعر کے بعد مطبوعہ نسخہ میں اشعار لکھے ہوئے ہیں۔

شہر چھوڑا ڈیرا میں باہر دیا
توکل خدا مصطفےٰ پر کیا

کہ تم ہو سپاہی ، میں سردار ہوں
بھلے اور بُرے کا میں تم خوار ہوں

نسخہ آصفیہ میں یہ اشعار اوپر، نیچے لکھے ہوئے ہیں۔

دسے یوں سردار ساریاں منے
کہ جیوں چاند ہے کل ستاریاں منے

نقاری دمامے بجاتے چلے
روپا ، اشرفیاں لٹاتے چلے

کہا جاکے دن ایک بڑا مقام
کرے فکر تدبیر ہر صبح و شام

جہاں لگ سپاہی اور نوکر امیر
بولاکر کہا خاں روشن ضمیر

نسخہ آصفیہ میں اس شعر کے بعد یہ اشعار لکھے ہوئے ہیں۔

کہ تم ہو سپاہی میں سردار ہوں
بھلایا ، بور اُس کا غم خوار ہوں

شہر چھوڑ ڈیرا میں باہر دیا
توکل دوا مصطفیٰ پر کیا

سنو بات دل کی کہ کہتا ہوں میں
کہ جس فکر میں غرق رہتا ہوں میں

یہ شعر مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے۔

کہاں سو کہاں اور کدھر سوں کہاں
کہ بارے سوں قسمت نے لائی یہاں

میرے دل کو رحمت سوں شاباش ہے
جوانی میں جیو کا بڑی آس ہے

جیئے لگ ہو یاراں میرے سات میں
رہو وقت جن کے میرے ہات میں

جدھر مار کا آپڑے گا وہاں
جدھر کے تدھر بار کرتا وہاں

ہے یاراں کا کل جنگ منے تنگ نام
میں منگتا خدا سوں یہی ہے شام

خبر سن مقاماں کی ماں مہربان
تڑپنے لگے دیکھنے جیو پران

کہے ماں سوں میں پھر تم کوں کہاں پاؤنگا
اگر جنگ میں سوں میں پھر آؤنگا

(مطبوعہ نسخہ میں یہ دونوں اس طرح لکھے ہوئے ہیں۔)

منگاو سرو پاو دستار یو
میرے روبرو و جواب بھر سب کوں دیو

کہاں سوں کہاں سوں کیا سوں کہاں
لئے آئی ہے قسمت کی بازی یہاں

میری جیو کوں رحمت وہی شام ہے
جوانی میں جیوں پڑی آس ہے

جو لگ ہو بیں یاراں میرے ہات میں
رہو وقت جن کے سب میرے سات میں

جدھر مار کا آپڑے گا وہاں
اُدھر بیگ دل ہو کے کرنا رواں

ہے یاراں کا کل ہند میں نیک نام
میں منگتا ہو ، نت آبرو صبح ، شام

خبر سن مقاماں کا ماں مہربان
تڑپنے لگیا جو اور سب پران

کہا ماں سو تم کوں میں پھرپاونگا
اگر جنگ سو بہار پھر آؤنگا

اورنسخہ آصفیہ میں یہ دونوں اس طرح لکھے ہوئے ہیں۔

بزان کئے کہ سر ، پاؤں ریاں کوں
میرے روبرو فیول پھرسب سوں کہوسوں

لئے آئے سروپار بڑے سوں کی
زر زر کشی و صاف لئے مول کی

منگا نہو سروپاوے میرے قول کے
زری کش میرے صاف لئے مول کے

زاہد خاں جہاں لگ آتھے آس پاس
پھر اے ....

جہاں تلگ جو سردار تھے روشناس
یوں بھیج کر سب کتیں آس پاس

(حاشیہ میں یہ شعر اس طرح لکھا ہوا ہے)

جہاں لگ تھے سردار نے روشناس
بلا بھیج کر سب کے آس پاس

سروپا و ہر یک کوں سو دینے لگے
سلام اور تسلیم لینے لگے

سر پاؤ ہر یک کوں دینے لگے
بجا لیا کہ تسلیم لینے لگے

کہئے آفریں تم نمک خوار ہو
وفادار ہے شک و غم خوار ہو

کہئے آفریں تم بہو غم خوار ہو
وفادار بے شک سو دل دار ہو

کیسے ماں کوں تسلیم دینے سلام
کیسے کوچ بیگی سوں بس والسلام

بزاں ہو داغ ماں سوں کہتا سلام
کیا کوچہ واں سوں اپس و سلام

کہے فوج اپنی پیا بے شمار
جو دیکھے تو موجود چالیس ہزار

کہ پھر فوج کا اپنے کہئے شمار
جو دیکھے کو ہی فوج چالیس ہزار

تھے لئے شتر نال کنج نال بان
سنے کوئی شلک تو جاوے پرانی

تھے ئے شتر نال بان
سنے کوئی مطلق تو اور جاوے پران

کہلاکر جو بھیجا سلام اور دعا
لڑائی میرے سات کہا ہے نفا

کہہ لایا سلام ، کہلایا دعا
کہ لڑنا میرے سات نہیں کچھ نفا

اگر لاکھ دو لاکھ فوجاں ملیں
کہ (جس سے) طبق سب زمیں کے ہلیں

اگر ہم حیاتی تم غم نہیں مجھے
اگر موت ہے تو وہم نہیں مجھے

جو مارا ہے قسمت میں میرے قلم
نہ ہووے زیادہ وتاں ہووے کسم

رضا پر میں راضی ہوں جو ہے رضا
وہی ہوئیگا جو کریگا خدا

میں راضی رضا پر ہو باندھا کمر
رکھا ہوں میں القصہ حق پر نظر

خدا کا کرم مصطفٰے کی پناہ
میں رکھتا ہوں اس بات پر سب نگاہ

بہرحال لے فوج اتریا ندی
پکڑ دل میں دعوی وو ندی بدی

ایدھر سوں بولشکر اودھر سوں وو فوج
پڑی آکو جس میں سمندر کی موح

تفاوت رہا کوس دوچار کا
حکم تب ہوا اس جو کرتار کا

اگر لاکھ دو لاکھ فوجاں ملیں
کہ جس کے دہمکیوں طبق سب ہلیں

بہرحال اور فوج اوتری ندی
پکڑ دل میں وندی وندی و دعوابدی

ایدھر سوں یولشکر اور دہر سوں او فوج
پڑی آ جیوں سمندر کی موج

تفاوت رہیا کوس دوچار کا
حکم یوں ہوا اس پہ کرتا رکا

نپٹ
برسنے لگے رات دن ہر شکال

کتیک دیس گذرے سو اس بات کوں
دیا کوئی خبر آدھی رات کوں

اگر ہے حیاتی تو غم نہیں مجھے
اگر مدت ہے وہم نہیں مجھے

جو ماریا ہے قسمت میں میرے قلم
نہ ہوئے زیادہ نہ ہوے او کم

رضا پر میں راضی ہوں جو کچھ رضا
وہی خوب ہے کوریگا خدا

حکم تب ہوا صاحب ذوالجلال
برسنے لگیا رات دن یہ شگال

کتیک دن سو گذرے اسی بات کوں
دیا کوئی خبر آ آدھی رات کوں

(۱۹۹) میں راضی پر ہو باندھا کمر
رکھا ہوں میں القصہ حق پر نظر

(۲۰۰) خدا کا کرم مصطفٰے کی پناہ
میں رکھتا ہوں اس بات پر سب نگاہ

کہو کیا خبر آج ہے دوستاں
اُٹھا یوں بیگی سے عباس خاں

منگا و میرا خود توڑا منگاؤ
میرے خاص گھوڑوں کوں پاکھر لگاؤ

(یہ اشعار نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے۔)

منگا او کماناں میری سات کہاں	منگاؤ کماناں میری ہات کہاں
کہ ہیں رات دن وو میری ہات کہاں	جو ہے رات دن میرے او سات کہاں
منگا اُس پر آہنی پھول دار	منگاؤ اُس پر آہنی پھول دار
کہ رہتے ہیں وونت میرے گلے میں ہار	سواری میں اچھتے اوہم سوں یار
سنگا او میرا بانک جنجر منگاو	منگاؤ میرا خود او ....
میری خاص پالکی کوں جھالر لگادو	میرے گھوڑے کوں خوب ....

میرے ہاتی کوں جاکے صندل لگاؤ
وقت لئے ہوا ہے درنگ مز لگا

ہتی کوں میرے جاکو سرسوں بنداؤ
جو دے کوں جن کی

کیا جا غسل کر اٹھایا دو ہات
کہا یا نبی سرور کائنات

کیا جا غسل اور رچا ماہی ہات
کہا یا نبی سرور کائنات

تمن گوں میری آج یو لاج ہے
مدد کوئی تم بن نہیں آج ہے

تمن کوں میری لاج کی لاج ہے
مدد کوں تم بن مجھے آج ہے

کمر باندھ بہاتا اشکوں پنہاں
لگیا پونچھنے موکوں دے دے رومال

کمر باند بہتا اشکوں سنبھال
لگیا پوچھنے موں کوں لے لے رومال

کہا بیگا سب فوج بندی سنبھال
فتح دیوے تمناں کوہ رب ذوالجلال

کیا تم اوپر فوج بندی سو چال
فتح دیوے تمنا کوں رب ذوالجلال

یو دانے تسبیح کے میں امام
رہیں ایک ہوکر سو یل مل مدام

لو دانے ہیں تسبیح کہ میں ہوں امام
رہیں اُن لیک میں ہل مل مدام

رفاقت کرو زندگی سہل ہے
شرافت میں نامردی جہل ہے

سہنا مت کرو زندگی سہل ہے
شر میں مت لیاؤ صرف مہل ہے

خدا کے کرم کا ہوں امیدوار
رکھے لاج میری سو پروردگار

خدا کے کرم کا ہوں امیدوار
رکھے گا مری آج پروردگار

میں سید ہوں اُن دل میں کیا لائے ہیں
میرے گھر پہ ناحق خلل لائے ہیں

میں سید ہوں مجھ پہ اوجل آئے ہیں
میرے گھر پو ناحق بلا لائے ہیں

کھڑا چڑھ کے ہوں دے کماں کوں سنبھال
کیا جوش میں یوں انکھیاں کر کے لال

کہا تم ہر اول کے سب ساتھ جاؤ
ہر اول کوں ان سات بیگی ملاؤ

امین خاں کوں بولے کہ سن لیوں بات
تمہیں فوج کامل لے جاؤ سنگات

(ان اشعار میں مصرعے اوپر نیچے لکھے گئے
ہیں۔)

امین خاں کہے رہ میں دستا خلل
گیا دور ہمارا ہر رول نکل

مدد کو ہو آئے تو کچھ کر دکھاؤ
ہو بے شک اپس دل میں کھانڈا چلاؤ

تمہاری میری کچھ جدائی نہیں
تمہیں خویش ہو کچھ سپاہی نہیں

(یہ دونوں شعر نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے۔)

مہاوت پڑیا فیل سیتی نکل
لگا پانوں اپنے کوں ڈھلنے اگل

کہیا چڑھ کے ہو دے یو سینا نکال
کہا جوش میں آ کے انکھیاں کول لال

کہا تم ہر اول کے سبب ساتھ جاؤ
تمہیں فوج کامل لیو اپنی سنگات

امین خان کو سنتے ہو بات
ہر اول کو جا بیگ بیگی ملاؤ

کھڑے ہو کے رہنے میں دستا خلل
گیا دور ہمارا ہر اول رستگل

ان کے ہو کے تم کچھ مدد کر دکھاؤ
ہو بے شک اپس دل سوں کہا نہ

تمہاری میری شرم اب ایک ہے
کرنے کی وہی جس میں جو نیک ہے

یہیں اُس کفن انمیں یو تھا بچار
پھری فوج سید یوکل اشکار

(یہ شعر مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے۔)

بڑیا چھوٹ اُس سوں مہاوت نکل
لگا پاؤ دہکھیلا اگل

تہور خاں کوں اتنے میں گولا لگا
لگا سو ہیچ ہاتی اوپرتے ڈھلا

غیاث خاں کوں اتنے میں گولا لگا
لگیا سوچہ ہاتی اوپرتے دہلیا

(مطبوعہ نسخہ میں تہور خان نام آیا ہے جبکہ آصفیہ میں غیاث خاں نام لکھا ہوا ہے۔)

اپے تھا ہتی تھا ویک تھا خدا
ہوے شاہ سوں سب سنگاتی جدا

ہوں پے سات سوں سب عزیزاں جدا
ہتی ٹھار تھا آپ او یا خدا

دو ترکش لے ایسے میں خالی کیا
سنگل تن کو زخماں سوں جالی کیا

اور ترکش بنہ ہر دسے میں بے خار کیا
سنگل تن کوں زخماں کی جالی کیا

لگے تیر بھرنے اس تیر کوں
چلا کر بھرا کر بڑی دہیر سوں

لگے تیر سرا وا دسے تیر کوں
چلا ویں پھرا کر بڑی دہیر سوں

لگاوے جسے تیر کہہ کہ کماں
وو لاگے جسے سو کئے لا مکاں

لگا کر چلے کوں بھی کھینچے کماں
لگا دیں جیسے سو سلاویں اماں

یکا یک لگے موں اوپر پنج تیر
ہوے پار گالاں سوں پردے کوں چیر

یکا یک لگے موں کوں آپا تج تیر
ہوے یار گالاں کی برایاں کوں چیر

لیا کھینچ کر اور کیا خوب زور
آہستہ سٹیا تیر پیکاں مڑور

تمہاری میری شرم سب ایک ہے
کرو گے وہی جس میں جو نیک ہے

تمہاری میری کچھ جدائی نہیں
تمہیں خویش ہو کچھ سپاہی نہیں

(یہاں اشعار اوپر نیچے ہوگئے ہیں)

کہ دنیاں یو دو بہار کی جھاوں ہے
جنم جک لکوں یہاں کہے ....

(یہ شعر مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے)

سو ایسے میں آکر کہا کوئی سوار
ہر اول یو بھاری پڑی ہے جو پار

ہو ایسے میں آکر کیا کوئی سوار
ہر اول یو صاحب کے ہے مار مار

رہے فوج جاں کی تھاں سب ٹھٹک
چلے ہیں جدھر کے تدھر سب بٹھک

رہے فوج جاں کی تھاں سب ٹھٹک
ہر اول رہیا سو سرکوں بٹھک

جو ہوتا اگر رستم افرا سیاب
تو ہرگز نہ کرنا وہ ایسا شتاب

جو ہوے اگر رستم افرا سیاب
تو ہرگز نہ کرتے و ایسا شتاب

بڑیا ٹوٹ ایسا ہوا سار کڑک
کسی بات کا دل منے نہیں تھا دھڑک

پڑیا ٹوٹ جلدی سوں ایسا کڑک
کسی ماں .... جو سبھا

تمہارے بن کا کچ اریاں ہے
ٹلو مت یو مردان کا میدان ہے

پلے ہم و تم ہم کوں ارمان ہے
ٹلو مت یو مردوں کا میدان ہے

لگا مارنے تیر گولی چلاؤ
کہا فوج کوں سب کی گودی اٹھاؤ

لگیا مارنے تیر کڑک یوا
دیا فوج یک بار سب اٹھا

گذرے جاے بکتر وچلتہ کوں پھوڑ
زرہ کہ کڑیاں ڈھال کے پھول توڑ

گذر جائے چلئے دے کر کوں پھوڑ
زرہ کی دیاں کی پھول توڑ

جسے تیر ماریں کہ ازو کریں
سکت کیا تھی جو زور بازو کریں

جسے تیر مارے کردیں ملائی
سکت کیا اسی اور بھروسہ رو حا ......

رہے کیوں کھر دے جا بجا ٹھار ٹھار
نھنے اور بڑے سب پیادے سوار

کھر دے جوں رہتے بتوں رہے ٹھار ٹھار
نھنے ہور بڑے کل سیاہی سوار

چلا کوئی مشرق چلا کوئی غروب
چلا کوئی شمال اور چلا کوئی جنوب

چلیا کوئی مشرق چلیا کوئی جنوب
گیا کوئی شمال گیا کوئی غروب

محبت کی کچھ کسی منے پاس نہیں
دیکھو دستاں کوئی میرے پاس نہیں

بہرحال دنیا یہ گز ران ہے
لگا رکھ اب موت سوں دھیان ہے

جب لگ دم میں دم ہے کریں کار زار
رہیگا جو عالم ملے یادگار

(یہ تین اشعار نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے۔)

مہر خان غوری نے بولیا نواب
ملے مل گئے سب یوجانے خراب

مہر خاں غوری نے بولیا نواب
یو مل مل گئے سب یو خانہ خراب

(مطبوعہ نسخہ میں اس شعر بعد یہ اشعار ملتے ہیں۔

(آصفیہ نسخہ میں اس شعر کے بعد یہ اشعار ملتے ہیں۔

کیا شیخ اکبر نے آکر عرض
کہ مرناں ہمیں اب ہوا ہے فرض

مقرر ہوا ہے یو تقدیر سوں
مٹانا سکے کوئی تدبیر سوں

مقرر ہوا ہے جو تقدیر سوں
مٹا نا سکے کوئی تدبیر سوں

اسی گفتگو میں کہ تھا یو بچار
پھری فوج سید کی کل ایکبار

پڑا مار کا تیر اور بان کا
پڑا ان کھنڈل خوب گھمسان کا

لگے تیر پر تیر اس شیر کوں
چلاوے پھرا کر اُسی تیر کوں

لگا تیر چلے کوں کھینچی کماں
لگاوے جیسے سب گئے وو جہاں

(یہ تین اشعار نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے)۔

کیا شیخ فیفو نے اکر عرض
کہ جان پاک مرنا ہوا اب فرض

سٹیاچ اور بھار کاڑ وہاں کا وہاں
دیا جواب اُس تیر کا در زماں

سٹا چیر اور پھاڑ کر وہاں کا وہاں
دیا جواب اُس نیر کوں در زماں

پڑا آ کے گھوڑے سے جب کیا کے تیر
کہا کیا امیروں میں تھا بے نظیر

پڑاں آ کے گھوڑے سے سوں جب اور تیر
کہا کیا جوان مرد ہے بے نظیر

سو اپنے میں کوئی اور ہو دے سوار
وو آ سامنے دل کوں کر استوار

سو اپنے میں کوئی اور حوویں سوار
ہوا سامنے دل کوں کر استوار

لگایا اُسے تیر ایسا شتاب

لگایا اُسے تیر ایسا شتاب

جو دے نا سکا پھر کر اُس کا جواب	جو دے نا سکا کچھ پھر اُس کا جواب
(مطبوعہ نسخہ میں اس شعر کے بعد یہ اشعار ہیں۔)	آصفیہ نسخہ میں اس شعر کے بعد یہ اشعار ہیں۔
بھی ایسے میں آ کوئی نیزہ سبھال غروری سے سید پو مارا نکال	جو دیکھیا سو تیر اُس کوں مار یا اچھل پڑیا کاونج گھوڑے اوپر تے نکل
جو دیکھا اسے تیر مارا اچھل پڑا پھر کر گھوڑے اوپر سے نکل	پھر ایسے میں آیا کوئی تیرا سنبال غروری سوں سید پو دیدہ نکال
زرا مورچھا کھالے گردن پر آئے ہاتی کوں اشارہ سوں رنگے چلائے	زرا کاویں نہ گردن پر آئے ہتی کو اشارت تے آنگے چلائے
جو ایسے میں کوئی پیرزادہ فقیر بہوت خوبصورت و صاحب نظیر	سو ایسے میں کوئی پیرزادا فقیر نپٹ ہانک ماریا ای صاحب امیر
ہستی ہول آکر ہوا روبرو کہ جانو نظام الملک ہیگا تو	ہتی ہول اُن کی ہوا روبرو کہ جانیاں نظام الملک ہو بہو
کہ جلدی سو دو تیر ایسا جڑا سو ہو دے میں بے ہوش ہوکر گرا	یکایک او تیر اُس کوں چیرے جو ہودے میں بے ہوش ہوکر پیرے
زخم پر زخم جب لگے بے حساب ہوا مست تب سید عالی جناب	زخم پر زخم جب لگے بے حساب ہوئے ٹکہ سن سید او عالی جناب
ہو آن آ پڑی مار تلوار کی بڑے زور کی اور بڑے مار کی	بزان آ پڑی مار تلوار کی بڑے زور کی اور بڑے بہار کی

عزیزاں گئے چھوڑ سارے نکل نمک کی شرط نا رکھے گئے نکل	عزیزاں گئے چھوڑ سارے نکل نہ ....
سٹیا ہات ہمت سوں شمتیر پر سو مارے دیکھو جھٹکہ ہو دے اوپر	سٹیا ہات شمتیر ہمت سوں کر ....
لہو لال موں کے اوپر یہ چلا اِدھر کا اُدھر جا بجا یہ چلا	او ہاتاں سوں شمتیر بازی کیا مگر کربلا پھر روتاریں کیا
(یہ شعر آصفیہ نسخے میں نہیں ہے)	(یہ شعر مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے۔)
لئے ڈھال موں پر اپس کو چھپالے ایدھر کا اُدھر مار کوں موں چکالے	ہوویں ڈال موک پرتے ہٹ ہٹ کہ جائے ادھر کا اُدھر، اُدھر مارسوں موں پھر آئے
لئے آکے ہودے کو ہودوں سے گھیر ہوا تب ہواساں کیا دل دلیر	 لگے جاں ....
سبھی مغل اور بان کے ڈنڈاں کوں کاٹ لگے ہودے پر چڑھنے رسیاں کوں کاٹ	
دو ہاتاں سے تلوار بازی کری مگر کربلا پھر کے تازی کری	
(یہ اشعار نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے۔)	
انکھیاں پرتے لہو چلیا بے شمار لگیا پونچھتے پونچھتے اپنی رومال کاڑ	رکھیاں پرتے لہو جب جلیا بے شمار لگیا پونچھتے اپنا رومال کار

بوندان لہو کے موں پر پونچھا تمام
رہا دیکھنے سے وو سید انام

بندے موں پوچاپے لہو کی تمام
رہیا دیکھنے سوں ہے سید انام

اٹھے ایک تن پر ہزاروں کے غول
ہوا مار کے موں جدا سرسوں خوں

اٹھا ایک تن اور ہزاروں کا غول
قلم میں نہیں آتا زباں سوں او بول

جگر ٹوٹ لہو ہوکر آیا اوبل
چلے حیف تن پرتے گردن بے ڈھل

(یہ شعر آصفیہ نسخے میں نہیں ہے۔)

دے تال ہوددے تلے خان کوں
کہ دل سے پرے لال بے جان کوں

دے ڈال خود پے تلے خان کوں
سو اُس کن بھرے لال بے جان کوں

نہ جیو تھا نہ کچھ روح تھا کچھ نشان
نہ دم تھا نہ کچھ نور تھا جیو بجان

وہ اقبال ناصر کے گھر کا غلام
ہوا چُور زخماں سے لہو کے تمام

سو بے ہوش ہوکر پڑیا کھیت میں
اٹھایا سپاہی افسوس میں

(یہ تینوں اشعار نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے)

تھی تاریخ چھٹی ماہ شوال کی
بڑی سخت تر نحس جنجال کی

تھی تاریخ چھٹی او شوال کی
خبر شہر میں ہوئی سب اس خاں کی

خبر ہوئی شہر میں سو اس حال سوں
لئے مار کر جنت کے اس لال کوں

(یہ شعر نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے۔)

محل میں کیا جاکے کوئی یو خبر
کہ تل مل ہوا آج سارا شہر

محل میں دیا جاکے یو خبر
کہ تل ہے اوپر آج سارا شہر

اٹھے ماں نے افسوس کھا آہ مار
کہی عمر خان کوں کہ اب کیا بچار

اٹھے ماں افسوس کر رہ مار
کہ یک غم سوں خاں کی یو کہا ہر بچار

لے جانے کی بیگی اوتا ولی کیئے
لے جاکر دیکھو کیا خرابی کیئے

کیئے ہیں جو عالم علی خاں کوں
سعادت کی مسند کی سلطان کوں

یہ شعر نسخہ آصفیہ میں نہیں ہے اوراس کے مطبوعہ نسخہ میں یہ شعر ملتا ہے۔

جبکہ نسخہ آصفیہ میں اس شعر کے بعد یہ شعر ملتا ہے۔

ہوا غل بڑا کل محل میں تمام
جو کھانا و پانی ہوا سب حرام

ہوا کل محل میانے غل یو تمام
جو کھانا اور پانی ہوا ہے حرام

کہی ماں نے فرزند میرے نونہال
ہوا دیکھنا مجکوں تیرا محال

کہی ماں نے اے میرے فرزند ......
ہوا دیکھنا مجکوں تیرا محل

کہاں ہے وو فرزند عالم علی
تیرے دوکھ سوں سر پانوں لگ بس جلی

کہی کان ہے فرزند عالم علی
تیرے غم سوں سر پاؤں لک میں جلی

فلک پے ہنر نے کیا کیا ستم
گنوایا میری دھکدھکی کا بدم

فلک پے ہنر نے کیا کیا ستم
کہواں یا میری منکی جیو کا پدم

اوجالا میرے جیو کے ایوان کا
ستارا میرے ملک میدان کا

میرے زیب زینت کا تھا گل گلاب
تڑا کر کیا سب چمن کوں خراب

ہوا عیش آرام میں کیا خلل
عجب جیو تن سوں نجاوے نکل

نہ کھاوے نہ پیوے روے زار زار
میرا جیو پیت بن یوں ہے بے قرار

پکڑ بات کوں میں نکالی تجھے
پھر آکر تو مکھ نہیں دکھایا مجھے

کہے تھے فتح پاکے گھر آئینگے
یو صورت نورانی کوں دکھائینگے

کہ مہراں روپے بھر کے خیرات کی
خبر کچھ نہ تھی مجکوں اس بات کی

کہیں سدہ میں آوے کہیں سدہ گنوائے
نیناں سے انجھو ڈھال موتی بہائے

ہوے خود کہی تلملا ہانک مار
اے حافظ! اے ناصر! اے پروردگار

اوجالا میرے کھراؤ ایوان کا
ستارا میرے پاک میدان کا

میرے زیب زینت کا تھا گل گلاب
میرا گھر گیا سب اوڑا خراب

ہوا عیش آرام میں کیا خلل
قباحت لکوں نت رہیگا سو سل

نہ کھاوے نہ پیوے روے زار زار
مجھے جیوں تڑپتی ہے تبوں بے قرار

ہوے خود کہی تلملا ہانک مار
اے حافظ اے میری اے پروردگار

پکڑ ہات سو پے تھے یا رب تجھے
سبب کیا جو پھر نا دکھایا مجھے

تھی امید مجھ دل میں دیدار کی
میری فوج لشکر کی سروار کی

کیتے تھے فتح پاکے جب آئینگے
یو صورت نوی سرسوں دکھلائینگے

پھر آؤں کے بچ کر میں خیرات کی
خبر کچھ نہ تھی مجھ کوں اس بات کی

پکڑ ہات سونپی تھی یا رب جھے
سبب کیا سو پھرنا دکھایا مجھے

تھی امید یہ دل میں دیدار کی
میرے فوج لشکر کے سردار کی

پھراؤں کی خبراں میں خیرات کی
خبر کچھ نہ تھی مجھ کوں اس بات کی

ارے کوئی اس غم کی دارو بتاؤ
مجھے اس عزاباں سوں بیگی چھڑاؤ

ہو بے ہوش سو باریک بار بار
انکھیاں نے لہو روے وو زار زار

محل کے جن سے لوگ زیر و زبر
بڑے حیف کھا کھا کے ہو بے خبر

تیرے باج پیارے اندہا را دسے
خدا باج پیارا نہیں کوئی دسے

نہ فریاد کوں کوئی نہ کوئی داد کوں
بہرحال چلنا دولت آباد کوں

شہر ملک تھا جس کے فرمان میں
سو وو جا پڑے کوہ وویران میں

ہزاراں سپاہی ہزاراں غلام

ارے کوئی اس غم دارو بتاؤ
مجھے اس عزاباں سوں بیگی چھڑاؤ

ہوے............ ....
بڑے حیف کھا کھا کے تن میں جلا ......

کہی کہوں محل میں اندہا سرا دیسے
خدا باج کوئی نہیں کیوں میں کیسے

نہ فریاد کہے نہ کوئی ور کوں
بہرحال کیئے دولت آباد کوں

شہر ملک تھا جنکی فریاد میں
سو یوں جاں پڑے کوہ ویران میں

کیا لوٹ میں مال اسباب سب

کریں آکے تسلیم ہر صبح شام   یو قصہ نہیں ہے حکایت عجب

ہزاراں سوں گھوڑے ہتی بے شمار   لیا قلعہ میں ہور کیا قلعدار
ہزاراں چھڑی دار چیلے ہزار   میں مومن مسلمان ہو دین دار

ہزاراں امیراں رہیں تت مدام   میرے راج یکہ راج ہے
چھ صوبوں میں عزت تھا از بس تمام   میرا قول تمنا ستی آج ہے

نہیں فکر کچھ مجکوں سنسار کی   جو کچھ ہو تہارا اچھے گا سوئے
تھی امید واری سو دیدار کی   میں بیٹھا ہوں سب جاں سوں بات دھوئے

گیا لوٹ میں مال اسباب سب   رکھو دل جمع ہوا خاطر فرار
یو قصّا نہیں ہے حکایت عجب   لڑوں گا جو چل آئے یک لکھ سوار

نہ تھا زور کسی کوں نہ کسی کوں مجال   دلاسا دیا ہوا کھلایا سلام
سکے مار دم اور کرے کچھ سواں   دیا خوب رہنے کوں خاصہ مقام

چھڑاوے لے جا پل موں افلاک پر   مبارک تیرا نام تجھ پر اچھو
سٹے پل منے خاک کا خاک پر   یہ نوبت تیری تجھکو رہبر اچھو

تلا رام دیوان کا یتھ قدیم   شجاعت مردوں میں ہے بے نظیر
اتھا ساتھ اس حادثے میں خدیم   محمد علی نت اچھو دستگیر

پرندے کوں طاقت نہ پنکھ مارنے   ہوا بعد ازاں غل ہندوستان میں
نہ یارا تھا وہاں کسی کوں بچارنے   ہوا جنک مغلاں میں ہور خاں میں

چو بولے بچن سوے دستور تھا   ہوئی جب خبر جاکے نواب کوں
کرم رات دن جن کا مشہور تھا   حسین عالی خاں ہور شاہ کوں

انگے حوض لبریز اور گل بہار
صدر مسنداں جا بجا ٹھاڑ ٹھاڑ

سو ایسا ستم پوستم ہائے ہائے
یو دنیا بھی رستم کوی کیا تیار

کہاں وو نقارے دمامے نشان
کہاں وو عرابا کہاں توپ بان

کہاں وو صلابت کہاں وو حکم
کہاں فوج لشکر کہاں وو حشم

کہاں ہے وہ دولت کہاں ہے وہ مال
عجب قدر تاں ہیں تیری ذوالجلال

کہے مل اپس موں اپن اہل راز
سیادت کا ناحق ڈوبایا جہاز

نبوت کی انگشتری کا نگین
جگر گوشۂ فاطمہ بالیقین

پڑا گرد لو ہو منے لال ہو
گرا اکیلا رن موں بے حال ہو

ننھی عمر موں کیوں کھپایا اُسے
لے جاکر دیکھو دکھ دکھایا اُسے

کہیا کھود ماروں دکھن کی زمیں
یو کیا ہات ہمنا کوں آوے کمیں

بجق خداوند کون و مکان
نہ موغلاں کوں چھوڑوں نہ افکا ٹھکان

منگا توپ خانہ پر ہے دھات کا
نکالیا پورب ہور پنجاب کا

منگائے کیتک بان بند کے
ولے کے ادہین ہور سر ہند کے

ہزاراں جواں مرد شمشیر آن
ملے آکے بارے سوں سٹ ولی وطن

لیاسات حشام چو سٹ ہزار
یک ستے شجاعت میں ایک نامدار

اٹھا بول اگر ہے میرے جان میں جان
لکھاں پر لکھاں مار ڈالوں جوان

کہا غضب سوں اے خداوند کار
نظاماں سوں مجھ کوں ملا یک بار

اگر دشمن مجھ کوں بڑیا پائے تو
نکل جاؤں جو سامنے آئے تو

نہ آرام دل کوں نہ خاطر قرار
جگر جل دھڑکتا ہے جیسے انگار

جیئے لگ نہ اب کس تیں یاری کریں
یہ غم دل موں رکھ برد باری کریں

دنیا ہے دغا باز فانی مقام
ہے دل باندھنا اس سوں بالکل حرام

جسے پائداری سو نایاب ہے
یو دنیا دیکھو سو بسر خواب ہے

یو غم جگ مئے آشکارا ہوا
جگر ٹوٹ عالم کا پارا ہوا

ہزار آہ و افسوس ہے دوستاں
چھپا حیف دنیا سوں وو نوجوان

عجب سید علی نسب خان تھا
فراست کے دفتر میں سلطان تھا

کہاں ڈھونڈنا اب کہو خاں کوں
فراست کے موتی و مرجاں کوں

قلعہ میں قلعدار عالی قدر
سیادت کے رکھ نام اوپر نظر

گیا قلعہ میں اور کیا آشکار

زمین دندنانی لگی خوف کہا
پڑیا دھاک ملکی ملک جابجا

امیراں ہور و امرا و دکھار ہوں لے
چلیا ہے دکھن پر دمامے کوں دے

چلے تھے دو منزل دکھن کے کہن
ہوا اس میں تقدیر کا آگے یو فن

دغے سوں لئے مار نواب کوں
لئے لوٹ سامان اسباب کوں

عزیزاں جو کچھ ہے سو تقدیر ہے
بغیر از ضا کچھ نہ تدبیر ہے

چڑا ویں لے پل میں افلاک پر
سٹے پل میں او خاک در خاک کر

دنیا کی محبت کا پاتا خراب
یو جینا ہے پانی کا جیسا حباب

اگر مال دھن لاکھ در لاکھ ہے
سمجھ دیکھ آخر وطن خاک ہے

نہ جوتا رہیگا نہ دولت جنم
اے خاک سویا ہے کیا ہے وہم

کہاں او صلاحیت کہاں و قلم

میں مومن مسلمان ہوں دین دار
تمہاری میری لاج سب ایک ہے
میرا بول تمنا ستی نیک ہے

رفاقت تمہاری ہے جیو کے سنگات
میں جاگیر سوں منصب سے دھویا ہوں ہات

جو کچھ ہو تمہارا کرے گا سو ہو
میں بیٹھا ہوں سب بات سے ہات دہو

رکھوں دل کوں صاحب تمہیں برقرار
لڑوں گا جو چل آئے یک لکھ سوار

جو کچھ ہو تہارا سو ہوئیگا وو
میں بیٹھا ہوں سب سوں ہات دہو

کہاں ہے او لشکر کہاں او حشم

کہاں ہے اور دولت کہاں ہے او مال
عجب قدرتاں ہیں تیر پاں ذوالجلال

جو آیا ہے جگ میں سو مہمان ہے
یو جینا جیسا پھول اور پانی ہے

خبردار اچھو نین تو کملائیگا
حیاتی کی دم سوں نکل جائیگا

نہ دلکوں ہے راحت نہ خاطر کوں چین
کیا ہے یو قصّہ غضنفر حسین

تمت تمام شد

×××

ترقیمہ

دلاسا دیا اور کہلایا سلام
دیا خوب رہنے کو عالی مقام

مبارک تیرا تاج تجھ پر اچھو
یو ہمت تیری تجکوں رہبر اچھو

شجاعت کے زور میں توں فرد ہے
بہادر شجاع صاحب درد ہے

مراتب میں مردوں کے توں بے نظیر

نبی نت اچھو تجھ اوپر دستگیر

جو بولیا بچن سو رکھیا برقرار
اچھو شاہ مرداں کا تکوں ادھار

وو جگ میں نتیجا برا پائیگا
دنیا سہل ہے ناتوں رہ جائیگا

ہوا بعد ازان غل ہندوستان میں
ہوا جنگ بڑا مغل اور خان میں

شہادت کئے خان نے اختیار
کرے مغفرت خان کوں پروردگار

ہوی جب خبر جاکے نواب کوں
سیادت کی مسند کے محراب کوں

کہ عالم علی سید با خبر
کیا عالم معنوی پر سفر

سنیا اور سٹیا غم کی جا رگ میں
یو عالم علی خاں کے ویتاگ میں

کہا کھود تاروں دکھن کی زمیں
یہ کیا بات ہمنا یہ آوے کہیں

بحق خداوند کوں و مکاں
نہ مغلاں کوں چھوڑوں کا میں دراماں

منگا توپخانہ بڑے ڈھاب کا
بنگالا پورب اور پنجاب کا

منگائے گومک بان سب ہند کے
ولے جا بجا اور سرہند کے

جزائل شتر نال ہزاراں ہزار
رکھے صاف دھو دھو کر سب ایکبار

غلاماں کئے سرخ بانات کے
زرد اور سبز رنگ کئی ذات کے

ہزاراں جواں مرد شمشیر زن
ملے آکر بارہ سے سب ہم وطن

لئے سات احشام چوسٹھ ہزار
یک یک کس شجاعت میں سب نامدار

بڑے خاں، مٹھے خاں اوٹھے پول کر
کہ یک یک کوں پکڑونگا درکار زار

کہے اے خدا یا منجھے ایکبار
نظاماں ستی اُس لڑای کی بہار

اوٹھے بول اگر ہے مرے تن میں جان
کہ ایک بار سب ہم کوں کرنا اوٹھان

بحق خداوند پروردگار
نظام الملک سوں ملا ایکبار

اگر میں عدد اپنا پاؤنگا تو
نگل جاووں جو سامنے ہو

زمین دندنانے لگی خوف کہا
پڑا دھاک ملک میں ہوا جا بجا

امیراں و امراو لاکھاں کوں لے
چلا ہے دکن پر دمامے کوں دے

چلے ہیں دو منزل دکہن کے رہے
ہوا وونچہ تقدیر ہک دک رہے

دغے سے لئے مار نواب کوں
لئے لوٹ سامان و اسباب کوں

عزیزاں جو کچھ ہے سو تقدیر ہے
بغیر از رضا کچھ نہ تدبیر ہے

یو دنیا دغا باز و مکار ہے
ہوس اب جتانے میں ایار (عیار) ہے

فہم بے خبر عقل حیران ہے
دیکھو دوستاں اکیا یو طوفان ہے

دنیا کی محبت ہے بالکل خراب

یو دستا ہے پانی اوپر جیوں حباب

اگر مال دھن لاکھ در لاکھ ہے
سمجھ دیکھ آخر وطن خاک ہے

یو جیونا جنم ہے نہ دولت جنم
اُسے خاک سونا ہے کیا ہے وہم

جسے کچھ سمجھ بوجھ ادراک ہے
دنیا کی آلائش سوں وہ پاک ہے

مرے کا مرے گارے مرجاے گا
جو کچھ یہاں کیا ہےسو وہاں پائے گا

اگر بادشاہ ہے وگر ہے فقیر
اجل کے دنداں میں وہ دونوں اسیر

نہ گھر کام آوے نہ گھر چار آئے
نہ ماں ، باپ ، بھائی نہ کوئی یار آئے

جو آیا ہے جگ میں سو مہمان ہے
یہ جیونا سو جیوں پھول ہور پان ہے

خبردار اچھ نہیں تو کملائے گا
حیاتی کے دم سوں نکل جائے گا

کہاں گئے کہاں گئے کہاں ہیں بتا
اتھا مال دھن جن کا لا انتہا

اتھے شیر شرزے جنو کے غلام
ہوا خاک میں دیکھ ان کا مقام

کسے دل میں اپنے وولیاتے نہ تھے
منم میں اپس کے وو ماتے نہ تھے

سمجھ بوجھ بس گیا مل تیرا حساب
تیرے سار کے کئی پڑے ہیں خراب

نہ دفتر میں چھرا نہ گھر کوں ٹھکان
کیا فلک کرے گا تو اب ویران

نہ گھر کام آوے نہ فرزند رہے
نہ ماں ، باپ آوے نہ دلبند رہے

ہزار ہور سوتیس تھے سہ 1132 دواُپر
محمد کی ہجرت کوں سن کان دھر

پرایا چاند ربیع الاول کا آیا نظر
ہوا آحرت کا یو حکایت خبر

اتھا دن عزیزاں جمعرات کا
ہوا شہر و اختتم اس بات کا

اگر کوئی پوچھے یہ تجکوں حساب
سمجھ کر اسے بات کا دے جواب

محمد نبی پر درود ہور سلام
جتے ان کے اصحاب پر نت مدام

نہ ہے دل کون راحت نہ خاطر کون چین
کہا ہے یو قصہ غضنفر حسین

یو دنیا مدت تک چلی جائے گی
فیدی یو سیاہی سو رہ جائے گی

راقم الحروف نے یہاں مولوی عبدالحق کے مرتبہ متن کا تقابلی مطالعہ ادارہ ادبیات اردو کے قلمی نسخے اور کتب خانہ آصفیہ کے قلمی نسخے سے کیا ہے۔ چونکہ مثنوی نایاب ہے اور مختصر بھی ہے اسی لیے مثنوی کے مکمل متن کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم

مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی تذکرے

(الف) تذکرہ گل عجائب

تمؔنا اورنگ آباد کے ایک اہم شاعر اور نثر نگار تھے۔ میر اسد علی خاں نام اور تخلص تمؔنا تھا۔ ان کی سنہ پیدائش 1148ھ 1735ء یا 1149ھ 1736ء کو اورنگ آباد (۱) میں ہوئی۔ تمؔنا کے والد کا نام میر سید علی خاں اور دادا کا نام میر قطب الدین خاں (۲) تھا۔ تمؔنا کی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہی ہوئی۔ تمؔنا تذکرہ ''گل عجائب'' میں اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فقیر و او ہم مکتب بلکہ اکثر اوقات باہم در حصولِ کتب تحصیلی فارسیہ در جناب حضرت داور صاحب وقبلہ مدظلہ مثل شوکت و اسیر و چار عنصر مرزا سامع و قاری بودند۔ و در عربیہ شمع ادراکِ خود را از شعلہ توجہ میر صاحب میر انور الدین دلِ سلمہ، اللہ فروختہ، در عالمِ دوستیہا آشنائے یگانہ است، و در جہانِ آشنائیہا مفخر زمانہ''۔ (۳)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تمؔنا نے حضرت داور صاحب سے فارسی اور میر انور الدین دل سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ تمؔنا نے حضرت داور صاحب کا ذکر تذکرے میں تفصیل سے نہیں کیا بلکہ انور الدین دل کا مختصراً حالاتِ زندگی کو پیش کیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ تمؔنا حضرت دلؔ کی قابلیت اور صلاحیت سے بے حد متاثر تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''منبعِ فواضل، مجمع فضایل، مخزن معارفِ قدسیہ، معدنِ حقایقِ انسیہ، واقفِ اموراتِ معقول و منقول، کاشفِ وقایقِ فروع و اُصول، رمز شناس، قدسی منزہ میر انور الدین دلؔ''۔ (۴)

تمؔنا شاعری میں غلام آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جس میں آصف جاہ ثانی، نواب ناصر جنگ شہید، میر عبدالقادر مہربان، عبدالوہاب افتخار، افضل بیگ فافشاں، غلام علی ارشد، لچھمی نرائن شفیق اور اسد علی خاں تمؔنا تھے۔ مولوی عبدالحق نے گل عجائب کے مقدمے میں حضرت داورؔ صاحب اور میر انور الدین دل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا صرف آزاد بلگرامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''آزاد بلگرامی اورنگ آباد میں کئی سال مقیم رہے اور اکثر لوگوں

نے اُن کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ تمنؔا کو بھی شعر وسخن میں انھیں سے تلمذ تھا''۔(۵)

نظام علی خاں آصف جاہ ثانی اور اُن کے وزیر ارسطو جاؔہ کا دور اُردو ادب کی ترقی وارتقاء کا ایک اہم دور کہلاتا ہے کیوں کہ اس عہد میں فنون کو پھلنے پھولنے کا بہت موقع ملا۔ ارسطو جاہ کے عہد میں حیدرآباد میں اُردو اور فارسی کے کئی شعراء جمع ہوگئے تھے۔ اور ان میں سے اکثر شعراء اپنے زمانے کے استاد بھی گذرے ہیں۔ تمنؔا بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے ہم عصروں میں میر حسین علی خاں ایمان، شاہ تجلی، میر عباس علی خاں احساؔن، شیر محمد خاں ایماؔن، احسن الدین خاں بیاؔن، غلام حسین خاں جوہؔر، نقد علی خاں ایجاد، لچھمی نرائن شفیق اور اسد علی خاں تمنؔا وغیرہ شامل ہیں۔ تمنؔا جہاں ایک اچھے شاعر تھے وہیں اپنے زمانے کے استاد بھی تھے۔ اُن کے شاگردوں میں حکیم محمد اکبر خاں شرؔر، خواجہ ابو طالب آشفتہ، محمد علی خاں شوق اور مجاہد جنگ ارمان شامل ہیں۔

تمنؔا کے آبا واجداد ذریعہ معاش کی تلاش میں اورنگ آباد سے ہجرت کرکے حیدرآباد آ گئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ تمنؔا نے حیدرآباد میں تین درباروں سے وابستہ رہے۔ سب سے پہلے صمصام الملک صارم (صارم کا انتقال 1196ھ 1781ء)، اس کے بعد ارسطو جاہ کو دربار میں جگہ ملی۔ اور اسی زمانہ میں آصف جاہ ثانی کے دربار میں رسائی حاصل کی اور انتقال تک یعنی 1197ھ 1782ء سے 1204ھ 1789ء تک انھیں درباروں سے وابستہ رہے۔(۶)

تمنؔا کی شادی اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز سے ہوئی۔ امتیاؔز کا پورا نام لطف النساء بیگم اور تخلص امتیاؔز ہے۔(۷) ایک زمانے تک ماہ لقا چنؔدا کو اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ مگر اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ لطف النساء امتیاؔز اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''امتیاؔز اورنگ آباد کے استاد سخن شاعر تمنؔا کی زوجہ تھیں۔
> بیسویں صدی کے ربع اول کے تذکرے نگاروں جیسے سید شمس اللہ
> قادری، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری نے بھی

امتیاز کے بارے میں کوئی خاطر خواہ معلومات فراہم نہیں کیں جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک ماہ لقا بائی چنؔدا کو اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ سمجھا جاتا رہا۔جس طرح ڈاکٹر زور کی تحقیق نے ولؔی کے بجائے محمد قلی قطب شاہ کو پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا۔اُسی طرح دیوانِ امتیاز کے دستیاب ہوجانے کے بعد پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہونے کا سہرا امتیؔاز کے سر جاتا ہے۔ چنؔدا نے اپنا دیوان 1213 ھ مطابق 1798 ء میں مرتب کیا جبکہ امتیاز نے اپنا دیوان 1212 ھ مطابق 1797 ء میں تکمیل کیا۔اس ایک سال کی اوّلیت سے امتیاز اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ قرار پاتی ہیں''۔(۸)

جہاں لطف النساء امتیاز اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہے وہیں پہلی شاعرہ کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ مگر ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے حضرت بی بی فتح ملک اہلیہ حضرت قاضی محمود دریائی کو اُردو کی پہلی شاعرہ ثابت کئے تھے۔مگر حال ہی کی تحقیق میں حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ایم معین الدین نے سمینار ''اُردو زبان وادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ'' (28/2/2015) میں یہ ثابت کیا کہ اُردو کی پہلی غزل گو شاعرہ فاطمہ صاحب عرف بی بی صاحبہ زوجہ حضرت سید محمد قادری خا کی ہے۔

اقتباس ملاحظہ ہو:

''بی بی فتح ملک کا تعلق سرزمین گجرات سے تھا۔لیکن فاطمہ بی بی کا تعلق ادونی کے ایک مشائخ گھرانے سے ہے اور ادونی شروع ہی سے آصفیہ سلطنت کا اٹوٹ حصہ رہا ہے۔اس تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فاطمہ بی بی اہلیہ شاہ خاکؔی آصفیہ سلطنت کی پہلی معلوم غزل گو شاعرہ اور اس پس منظر میں ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اُردو کی پہلی غزل گو شاعرہ بھی فاطمہ بی بی ہے''۔(۹)

یہاں یہ بحث اس لئے کی گئی ہے کہ حال ہی کی تحقیق سے یہ معلوم ہوسکا کہ اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان

شاعرہ لطف النساء امتیاز اور اُردو کی پہلی غزل گو شاعرہ فاطمہ بی بی ہے۔ لطف النساء امتیاز نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی تھی اور امتیاز کے دیوان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک کامیاب شاعرہ تھی۔ اُس نے (186) غزلیں، (5) منسدس، (3) تین مخمس، (10) دس قصیدے، (3) تین مثنویاں، (15) رباعیات، (6) قطعات اور (3) فرد امتیاز اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ (۱۰)

تمنا اور لطف النساء امتیاز کی شادی کب ہوئی اور کس عمر میں ہوئی، اس سے تمام تذکرے خاموش ہیں مگر مثنوی ''گلشن شعراء'' کے اندرونی شہادت سے کچھ معلومات مل جاتی ہیں۔

تمنا کی سراپا نگاری کا بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

ہے نہایت شکیل و جمیل یک نوجواں — کہ تھا چشم آہو وو ابر و کماں
بنا کر وہ آنکھوں کے دوروں کے پھاند — لگالاو سے لیا کر محبت کا باند
ہر یک صید کا وو ہی صیّاد تھا — جو بے دادیوں کا ووہی داد تھا
وو تھا نازنین حور خو خوش مزاج — نہایت نزاکت سے نازک مزاج
قدسرو تھا باغ جانِ جہاں — جسے دیکھ خوش تھے زمیں و زماں
تکلّم تبسّم سے آمیز تھا — وہ ہر نکتہ اس کا دل آویز تھا
صفِ قابلوں پر ہی لایق تھا وو — جمع خوبیوں کا ہی لایق تھا وہ
وہ سب خوبروؤں میں تھا نام دار — کہ تھا کشورِ حُسن کا تاج دار
کہ تھا نازنین خوش شکل نوجواں — رکھے تیر مژگاں و ابرو کماں
عجب خوش ادا تھا نزاکت مآب — وہ سب ماہ روؤں کا تھا آفتاب
اُسی کا تو خانِ تمنا تھا نام — اسد تھا علی کا تھے روباہ رام (۱۱)

اور آگے اپنے لاولد ہونے کا ذکر بھی کیا ہے:

نہ کوئی ہے خلیفہ نہ کوئی جانشین — مشبہ بہ وو حرف نقش نگیں
ہر چند نہ پاو سے کوئی برگ یا بر ہی — رکھتا ہے جہاں میں کوئی کیوں ایسے شجر کو (۱۲)

ازدواجی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

مرا عشق ہے سال چھتیس کا سو برباد پل میں یہ کیا گیا
مشقت برس ہائے چھتیس کی سو یکباری ہائے دھوئی گئی
کرے نامۂ اعمال کوئی سیاہ کیا برس چھتیس اس میں تباہ (۱۳)

ڈاکٹر مہر جہاں نے ان اشعار کا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''قدیم زمانے میں سن شعور کو پہنچے کے ساتھ ہی لڑکیوں کی شادی کردی جاتی تھی۔ اس لئے یہاں ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ جب سنہ 1204ھ 1789ء میں امتیاز کی شادی کی چھتیس سال ہو چکے تو ان کا سنہ پیدائش سنہ 1154ھ یا سنہ 1155ھ 1742ء رہا ہوگا اور شادی کا سنہ 1168ھ 1754ء یا سنہ 1169ھ 1755ء قرار پا سکتا ہے''۔ (۱۴)

اس طرح تمنا 36 سال ازدواجی زندگی گذارنے کے بعد 1204ھ 1789ء میں اورنگ آباد میں وفات پائی۔ (۱۵) تمنا کی وفات پر اُن کے ہم عصر لچھمی نرائن شفیق اور شاگرد شوق نے تاریخ وفات کہی ہیں۔

خانِ تمنا اہل سخن رفقت جوان زرین دارفتن
بود ہنر ور صاحبِ فن رود ہوئے عقبیٰ رفت
بہرحال تاریخ اس غور چوکر و شفیق من
سال وفاتش ہاتف گفت ہائے یا ہائے تمنا رفت
1204ھ

شوق:

لیا جب تمنا نے راہِ عدم
ہوئی موجزن بحر اندوہ و غم
کہاں شوق کے سال تاریخ یہ
وفات بہشتی کرالے دل رقم
1204ھ

تمنّا کی ادبی یادگار میں ایک دیوان، ایک کلیات اور ایک تذکرہ گل عجائب ہے۔تمنّا کے دیوان کے تین نسخے موجود ہیں جس میں ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد اور دو نسخے انجمن ترقی اُردو (کراچی) میں محفوظ ہیں۔تمنّا کے دیوان تعارف کرواتے ہوئے نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''نمبر جدید (1448)، سائز (6x9 ¼)، صفحہ (104)، سطر (104)، سطر (18)، خط نستعلیق،

مصنف۔اسد علی خاں تمنّا، تاریخ تصنیف 1194ھ

آغاز:

رات دن درد زبان ہے نام اس اللہ کا
اصاف چہرہ جس نے بخشا اُس کو مہر و ماہ کا

لے ازل سے تا ابد ہر صبح سے لے تا شام
مصطفےٰ و مرتضےٰ ہے داد رس ہر آہ کا

اس دیوان میں ردیف وار غزلیات ہیں۔آخر پر کچھ قطعات ہیں۔

اختتام:

یوں عشق کی راہ تم نے سیکھی کب سے
اور حُسن کی چاہ تم نے سیکھی کب سے

دل سرد کب جنال ہے پیاری دم سرد
یہ ٹھنڈی آہ تم نے سیکھی کب سے (١٦)

تمنّا کے دیوان کے دو نسخوں کا تعارف افسر صدیقی امروہوی نے اپنی مرتبہ تصنیف ''مخطوطات انجمن ترقی اُردو'' (جلد چہارم) میں تفصیل کی ہے اور ساتھ ہی تمنّا کی حالاتِ زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''۳ر ۱۴۵، صفحات ۸۱، سطور فی صفحہ 15۔ تاپ۔ 6x9،
مصنف۔اسد علی خاں تمنّا اورنگ کے باشندے میر غلام علی آزاد بلگرامی
کے شاگرد تھے اور اپنے والد کے ہمراہ آصفجاہ ثانی (1173ھ۔

1218ھ) کے عہد میں حیدر آباد چلے گئے تھے۔ یہاں اول صمصام الدولہ صمصام بعد میں ارسطو جاہ (وفات 1218ھ) کے درباری شاعر رہے۔ عقائد کے لحاظ سے اثنا عشری تھے۔ 1204ھ میں وفات پائی......

سال تصنیف 1190ھ جو ختم نمودن سے برآمد ہوتا ہے۔ مشمولات ۔ صرف غزلیات ہیں، کاتب ۔ ندارد، سال کتابت ۔ 1227ھ، خط ۔ نستعلیق شکستہ آمیز۔

آغاز:

رات دن وارد زبان ہے نام اس اللہ کا
صاف چہرہ جس نے بخشا اُس کو مہرہ ماہ کا

ہے ازل سے تا ابد ہر صبح سے لے تا بہ شام
مصطفیٰ و مرتضیٰ ہے داد رس ہر آہ کا

اختتام:

جوانی ہے شرابِ ارغوانی ہے وہ جانی ہے
مرنے کے دن ہیں کیسے کس مزے کی زندگانی ہے

نہ ملتا اور نے پر کوئی بھی ہووئے سنا ہوگا
محبت ہے جہاں وہاں سو طرح کی بدگمانی ہے(۱۷)

141/3'' ،صفحات 119 ،سطور فی صفحہ 14 ،ناپ 5x18/2 ،مصنف ۔ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی سال تصنیف ۔ 1190ھ، مشمولات ابتداء میں غزلیات ہیں اور آخر میں رباعیات، کاتب ۔ ایشودی پرشاد، سال کتابت ۔ 1212ھ، خط ۔ شکست، آغاز ۔ نسخۂ اول کے مطابق،

اختتام ۔ ہزار شکر خداون قادر......رسید بہ زود بہ اتمام نسخہ پرون

چو بود دل بہ تمنائے سال انمامش بجہت ''ختم نمودن'' نوشت
خامودن 1190ھ۔(۱۸)

مولوی عبدالحق نے تذکرہ گل عجائب کے مقدمے میں تمنّا کے کلیات کی طرف صرف اشارہ کیا ہے۔اس کی کوئی تفصیل نہیں دی۔لیکن نصیرالدین ہاشمی اپنی تصنیف ''کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست میں تمنا کے کلیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''نمبر (144)، سائز (5x8)،صفحہ (288)،سطر (بلاتعین)، خط شکستہ، کاغذ دیسی،مصنف اسد علی خاں تمنّا،تاریخ تصنیف 1194ھ ہجری کتابت اسد علی خاں تمنّا دکن کا مشہور شاعر تھا۔اورنگ آباد وطن تھا پھر حیدرآباد میں اقامت کرلی۔ قادرالکلام شاعر تھا۔ مشکل ترین زمینوں میں شعر کہا کرتا۔ارسطو جاہ کے مدح میں قصائد بھی لکھے ہیں۔ ایک تذکرہ گل عجائب کے نام سے قلمبند کیا تھا جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے اور انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع بھی ہو گیا ہے۔ تمنّا کے بیسیوں شاگرد تھے۔1204ھ میں انتقال ہوا ہے۔دیوان کو تمنّا کے ایک شاگرد نواب مجاہد جنگ ارمانؔ نے مرتب کیا ہے:

آغاز:

چھوڑا لے کفر و عصیاں کا دور اہا دکھائے راہِ عرفاں بادشاہا
بچار کھ نفس و شیطاں سے الہا الٰہی معذرت خواہا پناہا
فآہا ثم آہا ثم آہا

اختتام:

یا الٰہی جب تھیں یہ شہر و دھر آباد ہو نت منیرالملک کے بخشش سے عالم شاد ہو
اس کے اعدا کے کتیں سر روز مثل گوسفند عید قرباں کی اوسے ہر دن مبارک باد ہو(۱۹)

تمنّا کی ایک اور تصنیف تذکرہ گل عجائب بھی ہے۔تذکرہ گل عجائب ایک نامکمل نسخہ ہے اور یہ نسخہ کتب

خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ تمنّا نے یہ تذکرہ 1194ھ میں ترتیب دیا۔ جب اورنگ آباد کی تذکرہ نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو تمنّا سے پہلے اورنگ آباد تین اور تذکرے لکھے گئے۔ جس میں ''گلشن گفتار'' (خواجہ حمید اورنگ آبادی)، ''ریاض حسنی یا تذکرہ فتوت'' (خواجہ عنایت اللہ فتوت)، اور ''چمنستان شعراء'' (لچھمی نرائن شفیق) ہیں۔

گلشن گفتار۔ خواجہ حمید اورنگ آبادی 1105ھ 1762ء:

تذکرہ گلشن گفتار کے مصنف، احمد خان نام اور تخلص حمید تھا۔ آپ کے والد ترک ناز خان اور دادا یکہ تاز خان تھے۔ (۲۰)۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاعری میں عاجز کے شاگرد تھے۔ حمید اورنگ آبادی نے اپنے استاد کے کلام کو دیوان کی شکل میں مرتب بھی کیا ہے۔ مگر ان کا اہم کارنامہ تذکرہ ''گلشن گفتار'' ہے۔ تذکرہ گلشن گفتار کی سنہ تصنیف میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کیوں کہ حمید اورنگ آبادی نے قطعہ تاریخ لکھی ہے۔

لکھا ہم نے جب تذکرے کو حمید ہوا خوش جسے فہم اشعار ہے
تلاش اس کی تاریخ کی کرکے دل کہا ''گلشن بزم گفتار ہے''
1165ھ

''گلشن بزم گفتار ہے'' سے 1165ھ عدد برآمد ہونے سے (۲۱) اور یہی اس تذکرے کی تاریخ بھی ہے۔ تذکرہ گلشن گفتار نہایت مختصر ترین تذکرہ ہے جس میں صرف 30 شاعروں کا بیان مختصراً کیا گیا ہے۔ تذکرے کی زبان فارسی ہے۔ حمید نے اس تذکرے کو حروف تہجی سے ترتیب دیا ہے۔ اس تذکرے میں دکن اور شمالی ہند دونوں علاقوں کے شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ ابتداء نصرتی سے ہوتی ہے اور اختتام عزلت پر کیا ہے۔ حمید اورنگ آبادی نے بھی میر اور قائم کی طرح اپنے تذکرے کو اُردو شعراء کا پہلا تذکرے ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ مگر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حمید کا تذکرہ ''گلشن گفتار'' دکن (اورنگ آباد) کا پہلا تذکرے ہونے کا اعزاز ضرور حاصل ہے۔

اورنگ آباد (دکن) کا دوسرا اہم تذکرہ ریاضی حسنی یا تذکرہ فتوت ہے۔ خواجہ عنایت اللہ نام تخلص فتوت تھا۔ 1123ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے (۲۲)۔ ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہی حاصل کیں۔ شاعری میں سید سراج الدین سراج کے شاگرد ہوئے۔

تذکرہ ریاض حسنی یا تذکرہ فتوت کی سنہ تصنیف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے اپنی تصنیف ''دکن میں اُردو'' میں سنہ تصنیف 1186 ھ،ڈاکٹر حنیف نقوی نے تصنیف ''شعرائے اُردو کے تذکرے'' میں 1173 ھ دی ہے۔ جبکہ فرمان فتح پوری نے اپنی تصنیف ''اُردوشعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' میں تذکرے کی سنہ تصنیف پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس میں بسلسلۂ تاریخ تصنیف مندرجہ ذیل رباعی ملتی ہے۔

تاریخ بنائے ابن ریاض حسنی
جستیم زفیضِ خاص خاصِ آلِ مدنی
از روئے سرود بذل ہاتف گفت؟
گلدستہ ریحان بہارِ معنی

آخر مصرع کے اعداد میں صرف ''ب'' کے عدد شامل کرنے سے 1168 ھ نکلتے ہیں۔ یہی اس کا سالِ تصنیف کہا جاتا ہے''۔(۲۳)

رواج کے مطابق یہ تذکرہ بھی فارسی زبان اور حروف تہجی سے ترتیب دیا گیا ہے۔اس تذکرے میں 189 شعراء میں دکن اور ہند پر مشتمل ہے۔فتوت نے اس تذکرے میں دکن اور شمالی ہند کے دونوں علاقوں کے شعراء جس میں ابتدائی اور اپنے معاصرین کو بھی شامل کیا ہے۔اِس تذکرے کی اہمیت یہ ہے کہ یہ قدیم ترین تذکروں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے۔

اورنگ آباد کا تیسرا اہم تذکرہ چمنستان شعراء ہے۔شفیق کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔شفیق کا پورا نام ''لچھمی نارائن ماتھر'' ہے۔آپ کی ولادت 2 صفر 1158 ھ 1745ء کو اورنگ آباد میں ہوئی (24)۔بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ابتداء میں صاحب تخلص استعمال کرتے تھے مگر استاد غلام علی آزاد بلگرامی کے کہنے پر شفیق تخلص اختیار کیا۔شفیق اپنے دور کے شاعر، نثر نگار، مورخ اور تذکرہ نویس گذرے ہیں۔ان کی تصانیف میں تمیق شگرف، حقیقت ہائے ہندوستان، ماثر آصفی، حالات حیدرآباد، بساط الغنائم، خلاصۃ الہند، تحفۃ العالم۔ اس کے علاوہ تین تذکرے گل رعنا، تذکرہ شام غریباں اور تذکرہ چمنستان شعراء شامل ہیں۔

تذکرہ چمنستان شعراء اورنگ آباد کا ایک اہم تذکرہ ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا۔ شفیق نے یہ تذکرہ 1175ھ میں اورنگ آباد میں لکھا۔ یہ تذکرہ 212 شعراء پر محیط ہے۔ شفیق نے اس تذکرے کو حروف تہجی کے بجائے حرف ابجد کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ دوسرے تذکروں کی طرح اس میں بھی شمالی ہند اور جنوبی ہند کے شعراء کو قلمبند کیا گیا ہے۔

اورنگ آ اد ایک اہم تذکرہ ''گل عجائب'' بھی ہے۔ جس میں دکن اور شمالی ہند کے شاعروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسد علی خاں تمنا نے گل عجائب کو قیام حیدر آباد کے زمانے میں یعنی 1194ھ 1791ء کو ترتیب دینا شروع کیا اور اسی سال یعنی 1194ھ کو پایہ تکمیل کو پہنچا۔ سنہ تصنیف میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ کیوں کہ تمنا نے مخطوطے ابتداء اور اختتام پر سنہ تصنیف کی قطعہ تاریخ لکھ دی ہے۔

چوں ایں تذکرہ رانمودم شروع
زحق است امید اتمام او

تمنا بتاریخ سالش زمن
خرو گفت آغاز صفحہ بگو
1194ھ

اختتام:

تذکرۂ شاعراں شد چو تمام ایں زماں
شد دل و جان حزین مبہم

داشت تمنا ونم فکر بتاریخ او
آمد آواز غیب شکر خدائے جہاز
1194ھ

گل عجائب میں 51 شعراء کا تذکرہ موجود ہے۔ اسد علی خاں تمنا نے اس تذکرے کو حروف تہجی کے قاعدہ پر ترتیب دیا ہے۔ چنانچہ اس تذکرے کی ابتداء آرزو سراج الدین علی خاں سے اور اختتام یا کی مناسبت سے یار ممتاز جنگ بہادر یار پر کیا ہے۔ اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں دکن کے شعراء کے علاوہ شمالی ہند کے شاعروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس تذکرے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ بعض شعراء کے نام سوائے اس

تذکرے کے اورنگ آباد کے دوسرے تذکروں میں کہیں نہیں ملتے۔ مثلاً انصاف، افسر، انور، آشفیتہ، خیال، دل، رمز، سالم، عروج، فخر دیں، کاظم، غم، نیر، واقف، ہمدم اور یار وغیرہ وغیرہ۔ اس تذکرے میں اکثر شعراء کے حالاتِ زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیسے آرزو، ایجاد، آصف، حیرات، حشمت، فخر دیں، قدر، غم اور ہمدم ہیں۔

اس تذکرے میں بعض ایسے شعراء کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن کی سوانح یا نسب کی تفصیل نہیں ملتی۔ لیکن ان میں سے بعض شعراء کا کلام تین چار صفحات پر پیش کیا گیا ہے جیسے بلیغ، بیدار، شاہ پنچھی، کاظم اور یار وغیرہ تمنا نے اپنے تذکرہ میں چند فارسی شعراء کا بھی ذکر کیا ہے اور اُن کے کلام درج کیا ہے جیسے افسر، بیدل، پروانہ، دل، ناصر، نیر، مرزا مظہر جان جاناں وغیرہ۔

تذکرہ گل عجائب کو مولوی عبدالحق نے 1936ء میں ترتیب دے کر اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے شائع کیا۔ مولوی عبدالحق کی مرتبہ تصنیف 166 صفحات پر محیط ہے۔ مقدمے میں کوئی تفصیلی بحث نہیں کی گئی اور نہ ہی مقدمے میں مخطوطے کی کیفیت، ترک، ترقیمہ، صفحات کی تعداد، سطور کی تعداد اور نہ ہی مصنف کے حالاتِ زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ فاضل مرتب نے چند باتوں کا ذکر سرسری طور پر کیا ہے۔ مرتب کا فرض ہوتا ہے کہ مخطوطے میں موجود تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کریں۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مرتبہ تصنیف میں صرف اُردو کے کلام کو پیش کیا ہے اور شعراء کے فارسی کلام کو نظرانداز کر دیا ہے۔ مرتب کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ مخطوطے کے ایک پہلو کو پیش کریں اور دوسرے پہلو کو نظرانداز کریں۔ مخطوطے کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تذکرہ بہت مختصر ہے۔ بہ ظاہر کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔
> اس کا اصل نسخہ کتاب خنہ آصفیہ سرکار عالی میں محفوظ ہے۔ کانٹ چھاٹ
> بہت ہے خط بھی خراب ہے اور کئی خطوط میں لکھا ہے۔ ترتیب بھی درست
> نہیں۔ بعض شاعروں کے حالات ہیں تو کلام ندارد ہے اور کلام ہے تو حال
> ندارد بعض شاعروں کے نہ حالات ہیں نہ کلام، تاہم یہ تذکرہ نظرانداز
> کرنے کے قابل نہیں۔ اس میں کام کی باتیں مل جاتی ہیں''۔ (۲۵)

اس کے علاوہ مقدمے میں مخطوطے کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ مرتب کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ مخطوطے کی کیفیت کو تفصیل سے پیش کریں اور اُس کے ہر پہلو کا تفصیل سے جائزہ لے۔ تذکرہ گل عجائب ایک واحد نسخہ ہے جو آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی تصنیف ''کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات'' (جلد اول) میں مخطوطے کیفیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نمبر تذکرہ اردو (41)، سائز (8x13)، صفحہ (144)، سطر (9)، خط شکستہ، مصنف۔ اسد علی خاں تمنا، تاریخ تصنیف 1194 ھ کتابت 1195 ھ''۔ (۲۵)

مخطوطہ کا سب سے اہم پہلو اس کی سنہ تصنیف ہے۔ راقمۃ الحروف کے پاس مخطوطے کا عکس موجود ہے۔ مخطوطے کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ تمنا نے مخطوطے کو 1194 ھ میں ترتیب دینا شروع کیا اور اسی سال یعنی 1194 ھ میں پایہ تکمیل پہنچا۔ مولوی عبدالحق مخطوطہ کی سنہ تصنیف پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تذکرے کی تالیف کا آغاز 1192 ھ سے ہوا اور اختتام 1194 ھ میں جیسا کہ قطعات تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے''۔ (۲۷)

دکنی کے ہر محققین مولوی عبدالحق کی اسی رائے سے متفق نظر آتے ہیں کہ تذکرہ گل عجائب 1192 ھ میں ترتیب دینا شروع ہوا اور اس کے دو سال بعد یعنی 1194 ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ مگر راقمۃ الحروف مولوی عبدالحق کی اس رائے سے متفق نہیں کیوں کہ راقمۃ الحروف کے پاس مخطوطے کا عکس موجود ہے۔ مخطوطہ کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد راقمۃ الحروف کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مخطوطہ 1194 ھ میں ترتیب دینا شروع ہوا اور اسی سال یعنی 1194 ھ میں مکمل ہوا۔ اور اس کے دو سال کے بعد یعنی 1196 ھ میں تمنا کے مخطوطے پر دوبارہ نظر ثانی کیں کیوں کہ مخطوطے کے آخری صفحہ کے دائیں جانب تاریخی قطعہ درج ہے۔

قطعات ملاحظہ ہو:

چوں ایں تذکرہ را نمودم شروع
زحق است امید اتمام او

تمنا بتاریخ سالش زمن
خرد گفت آغازِ صفحہ بگو

1192

مرتب مولوی عبدالحق نے قطعہ کے آخری سطر میں ''آغازِ صفحہ'' کے نیچے لکھیر کھینچ کر 1192ھ لکھ دیا ہے۔ جب ہم ''آغازِ صفحہ'' کو حرف ابجد سے سنہ تاریخ نکالتے ہیں تو 1194ھ نکلتا ہے۔ جیسے:

آ، غ، ا، ز، (زیر)، ص، ف، ح، ھ،

2، 1000، 1، 7، 1، 90، 80، 8، 5،

1194ھ

اور 1194ھ ہی سنہ تصنیف صحیح ہے۔ کیوں کہ حرف ابجد میں زیر، زبر، پیش، سہ (مد) کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح تذکرہ گل عجائب 1194ھ میں ترتیب دیا گیا اور اسی سال پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ قطعہ تاریخ اختتام:

تذکرہ شاعراں شد چو تمام ایں زماں
شد دل و جان حزین منہج و شادماں

داشت تمنّا و نم فکر بتاریخ او
آمدہ آوازِ غیب شکر خدائے جہاں

1194ھ

اس کے دو سال کے بعد یعنی 1196ھ میں تمنّا نے مخطوطے کی دوبارہ سے نظر ثانی کیں۔ جس کی قطعہ تاریخ بھی موجود ہے۔

ہزار شکر جناب مولیٰ کہ تذکرہ شد تمام اکنوں
درد و بر ختم مرسلیں و برآں و اہل بیت او ہم

برائے اریخ سال ختمش چو بود در دل را تمنّا
گل عجائب شگفت نیکو بگلبن سادہ گفت طبم

1196ھ

تذکرہ گل عجائب کے مطالعہ سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ مصنف کی یہ تصنیف کتنے مقالات پر مشتمل تھی۔ کیوں کہ تذکرے کے پہلے ہی صفحہ پر ''رنگ دوم گل عجائب، من المقالات الغرائب'' لکھا ہوا ہے۔ یعنی تمنّا نے اپنے ہر مقالہ کو ''گل'' اور ذیلی ابواب کو ''رنگ'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جس کی تفصیل کو مولوی

عبدالحق نے مقدمہ میں بیان کیا ہے۔مگر مخطوطے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ یہ قلمی نسخہ یا کسی کاتب کا تحریر کردہ ہے۔مخطوطے کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’تذکرہ بہت مختصر ہے۔ بظاہر کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔ اس کا اصل نسخہ کتاب خانہ آصفیہ سرکار عالی میں محفوظ ہے۔کاٹ چھاٹ بہت ہے۔ خط بھی خراب ہے اور کئی خطوط میں لکھا ہوا ہے۔ترتیب بھی درست نہیں۔بعض شاعروں کے حالات ہیں تو کلام ندارد اور کلام ہے تو حال ندارد۔بعض شاعروں کے نہ حالات ہیں نہ کلام‘‘۔(۲۸)

مولوی عبدالحق کے اس بیان سے ایسی کوئی بات واضح نہیں ہوئی کہ یہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا کسی کاتب نے لکھا ہے۔لیکن مخطوطے کو دیکھنے اور مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ہو۔ کیوں کہ مصنف نے کئی جگہ کاٹ چھاٹ کی ہے۔ چنانچہ خیال کا ذکر دو جگہ لکھ کر ایک جگہ قلمند کر دیا گیا ہے۔ذکا کے حالات ایک جگہ تشنہ اور دوسری جگہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور آگے کے دو صفحات کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ سالم کے ذکر کے ساتھ اُسی صفحہ کے حاشیہ میں ’’حرف الشین‘‘ لکھ کر باقر کے حالات زندگی، فارسی اور اُردو کلام کو پیش کیا گیا ہے اور عاجز کے ذکر کو بھی دو جگہ لکھ کر ایک جگہ قلمزدہ کر دیا گیا ہے۔اور دوسری جگہ تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔اس طرح آصف، پروانہ، شاہ پنچھمی، جرات، خیال، کاظم، ہمدم، کے نمونہ کلام کے بعد خالی صفحات کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔اور دو تین مقامات پر روشنائی کے بڑے بڑے دھبے ہونے کی وجہ سے اشعار کا صحیح پڑھنا دشوار کن ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تذکرہ لکھنے والے نے لاپرواہی سے کام لیا ہے۔اجرتاً کام کرنے والا کاتب سے ایسی لاپرواہی کی توقع کم ہی ہوسکتی ہے۔اس لئے ہم یہ قیاس کرتے ہیں کہ یہ نسخہ غالباً تمنا ہی کے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا ہے۔

مولوی عبدالحق تذکرہ گل عجائب میں مخطوطے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’یہ تذکرہ نظرانداز کرنے کے قابل نہیں۔اس میں بعض کام کی باتیں مل جاتی ہیں‘‘۔(۲)

اور آگے لکھتے ہیں:

''اس میں بعض نئی اطلاعیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً آزاد بلگرامی کے
اردو دیوان کا ذکر جس سے مولف نے دوشعرا انتخاب کئے ہیں۔ یا تذکرہ
بہار وخزاں کا ذکر اوراس پر رائے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عروج کا
تذکرہ 1192ھ سے قبل لکھا گیا ہے''۔(۳۰)

اس تذکرے میں بعض نئی بلکہ بہت سی نئی اطلاعیں ملتی ہیں جس میں ایجاد کی حالات زندگی کو تمنا نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ایجاد کے اصلی نام کو بھی بیان کیا ہے۔

''گوہر صدف فصاحت ناوک ہدفِ بلاغت درفن گفتگو استاد نقد
علی خاں ایجاد۔ لزقومِ ناچار۔ نام اصلی او میر علی تقی، خلف الصدق نقد علی
خاں مرحوم ہمدانی کہ با شیخ علی خاں وزیر شاہ سلیمان صفوی بقرابتِ
قریبہ مشہور بود''۔(۳۱)

جبکہ چمنستان الشعراء میں شفیق نے ایجاد کے حالات زندگی کو دو مختلف مقامات پر تحریر کیا۔ شفیق نے میر تقی علی خاں اور نقد علی خاں کو دو الگ الگ شخصیتیں سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ہی شخص ہے۔ نقد علی خاں دراصل نقی علی خاں کا خطاب تھا جو ان کے والد کے انتقال کے بعد انھیں ملا تھا۔

انصاف کا ذکر اُس دور کے کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ صرف تمنا ہی ایک ایسے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے اُن کے حالات زندگی کی تفصیل دی ہے اوان کے نام، تخلص کا ذکر کیا ہے۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سحابِ فکرش در گلشن سخن چیں می بارد'' اور نمونہ کلام میں تمنا نے
8 اشعار بھی دیئے ہیں۔ افسر (باقر علی خاں) کا ذکر بھی سوائے تذکرہ
گل عجائب کے کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا''۔

افتخار کے حالات زندگی کو تمنا نے مختصر سے بیان کیا ہے۔ مگر افتخار کے استاد، تخلص اور ان کے تذکرہ کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

درنادر بندی ضرب المثل و نامدار، میر عبدالوہاب افتخار پیدائش،

والالیش از دولت آباد است، و درفن شاعر میر صاحب میر غلام علی آزاد
اوستاد۔ درریختہ بیکلؔ تخلص مینماید، بیشتر ازیں تذکرہ الشعراء مسمے یہ بے
نظیر رقم نمودہ، وتلاشِ فراوان بکار بردہ از وست‘‘۔(۳۳)

تمناؔ نے اپنے تذکرے میں افتخار کے دو تخلص کا ذکر کیا ہے۔ فارسی شاعری کے لئے افتخار اور ریختہ کے لئے بیکلؔ۔ جب کہ شفیقؔ نے چمنستان الشعراء میں تین تخلص جس میں ماتمی کا ذکر کیا ہے۔ شفیقؔ کے مطابق ماتمی تخلص افتخار اکثر مرثیوں کے لئے استعمال کرتے تھے اور تمناؔ نے افتخار تذکرہ ’’بے نظیر‘‘ کا ذکر کیا ہے جس کو مولوی عبدالحق نے پوری طرح نظرانداز کردیا ہے۔

تمناؔ نے جراتؔ کی زندگی پر خاص طور پر روشنی ڈالی ہے لیکن نمونہ کلام نہیں دیا ہے۔ البتہ میر غلام علی ارشدؔ کا کہا ہوا مادہ تاریخ وفات ’’بیسیر جاودانی گرد جرات‘‘ کو بھی لکھ دیا ہے۔

1174ھ

1174ھ یعنی تذکرہ گل عجائب کی ترتیب کے وقت جراتؔ کا انتقال ہوئے بیس سال گذر چکے تھے۔

ذکاؔ کی جو تفصیل تمناؔ نے دی ہے اُس دور کے کسی اور تذکرے میں نہیں ملتی۔ تمناؔ نے وفاؔ کی تاریخ پیدائش، لکھنو سے حیدرآباد آنے اور چچا غلام علی آزاد کے یہاں قیام اور نواب صمصام الدولہ کے دربار سے وابستگی کا ذکر کیا ہے۔

اقتباس ملاحظہ ہو:

’’میر اولاد محمد خاں ذکا، برادزادہ میر غلام علی آزاد، بیست وہفتم
شہر رجب المرجب 1151ھ در مقام بلگرام کو معمورۂ ایست از
مضافاتِ صوبۂ اودھ ہندوستانِ جنت نشان، قامت را بخلعت ہستی
آراستہ‘‘۔(۳۴)

آگے لکھتے ہیں:

’’چنانچہ اندیشۂ اوبشیر متوجہ نظم شد، واز ہمگی تحصیل دلش بر کند۔
در1172ھ حسب الطلب عمِّ مکرم خود میر صاحب آزاد از وطن بگلزمینِ

اورنگ آباد دکن رسید، و باستفادۂ ملازمتِ کثیر الافاضتِ میر صاحب مذکور مباہاتش دست داد، فواید علمی و نتائجِ فنونِ شعری اینجافوق الحد برخاطر اونقش بست پنج سال کاملے در حضورِ عمِ مکرم ماند ناگاہ برمزاجش محبتِ وطن غالب آمدہ ورخصت گرفتہ روانۂ منزلِ مقصود شد۔ میان الہ آباد ولکھنؤ وغیرہ امکنہِ صاحب کمالان سخنورانِ بسیار باو ملاقات کردند، ویکساں کامل و چند ماہ عزیزانِ وطن محشور ماند۔ آخر در 1179ھ نامۂ طلب اُو بار دُوم از پیشگاہ عمّش عز صدد ریافت، درہماں ایام باتبسیرۂ میر صاحب آزاد سید امیر حیدر نام عزیمت دکن اختیار کرد ونہم رجب 1179ھ قدمبوسِ عمّ اومنت بربش گذاشت۔ ایں بارنواب والاشان فیفر سال صمصام الملک بہادر میر عبدالحی خاں خلف الصدقِ نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں مرحوم بقدر دانی او پرداختند وبخطاب خانی اضافہ برنام و جاگیرِ مبلغ پنجہزار روپیہ از جنابِ رئیس دکن اورامسرور ساختند چہار سال یشود کہ درحیدرآباد دکن اقامت ورزیدہ دوام حاضر باش خدمت نواب صاحب موصوف است''۔(۳۵)

عروجؔ مولوی ضیاء الدین حسین خاں رنگین کے صاحبزادے جو ماہ صفر 1175ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اورانورالدینؔ دل، مہربان اور بلیغ کے شاگرد رہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمناؔ کے تذکرے گلِ عجائب سے اورنگ آباد کے ایک اور تذکرے کا نام ''تذکرہ بہار خزاں'' کا بھی پتہ چلتا ہے۔

''درنیولا تذکرۂ الشعراء مسمیٰ بہ خزان و بہار نوشہ دوراں تلاشہا کردہ کردہ، ہرکس کہ می بیندمی داند کہ چہ خو،نہا خوردہ''۔(۳۶)

مولوی عبدالحق نے نہ تو مقدمہ میں عروج کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی ان کے تذکرے کا گل عجائب ہی اُس دور کا ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں عروج کی حالات زندگی کے علاوہ ان کے تذکرہ ''بہار خزاں'' کا ذکر بھی کیا ہے۔

تمنّا نے تذکرہ گل عجائب میں فضلی (شاہ فضل اللہ) کے حالاتِ زندگی کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا ہے بلکہ اُن کا رسالہ ''زردِ آزاد'' کے علاوہ ہندی زبان میں قصہ پریم لوکا اور قصّہ برہٗ بھبھو کا ذکر کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مظہرِ کمالاتِ خفی وجلی، شاہ فضل اللہ فضلی، خلف الصدقِ سید عطاء اللہ اورنگ آبادی است۔ رسالۂ زادِزاد اورعلمِ سلوک رقم نمودہ، و قصۂ برہٗ بھمھو کا وقصّہ پریم لوکا بزبانِ ہندی از و یادگار است''۔ (۳۷)

تمنّا کے سوائے کسی اور تذکرہ نویس نہ تو فضلی کے حالاتِ زندگی کی تفصیل پیش کی ہے اور نہ ہی اُن کے رسالہ اور ہندی قصوں کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ مولوی عبدالحق نے مقدمے میں ان تمام چیزوں کو نظرانداز کردیا ہے۔

''کاظم کے بارے میں تمنّا نے صرف ایک مختصر سا جملہ لکھ دیا ہے۔ ''اقلیم سخن را کاظم صوفی شاہ کاظم''۔ (۳۸)

اس کے بعد نمونہ کلام میں 168 اشعار ملتے ہیں۔ اورنگ آباد کے دوسرے تمام تذکرے کاظم کے ذکر سے خاموش ہیں۔ اس طرح نیر (مہدی علی خاں) کے حالاتِ زندگی اور ان کا نمونہ کلام کا ذکر کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا۔ تمنّا نے بھی ان کی زندگی کی تفصیل بیان نہیں کی ہے۔ صرف ایک کام کی بات یہ کہی ہے کہ نیّر، نقد علی خاں، ایجاؔد کے والد تھے اور نمونہ کلام بھی نہیں دیا ہے۔ واقفؔ (نورالعین)، ہمدم (شاہ محمد تقی) اور یار (مرزا محمد یار بیگ) کے تعارف کے سلسلے میں بھی تمنّا کا تذکرہ گل عجائب ہی واحد ماخذ ہے۔ ہمدؔم کے بارے میں تمنّا نے لکھا ہے کہ وہ ہمدؔم ہاشم علی خاں کا پوتا اور مرزا محمد کا فرزند تھا۔ اور حضرت شمس الدین محمد کے مرید تھے اور شاہ صاحب نے انھیں اپنا داماد بنالیا تھا۔

غرض تذکرہ گل عجائب دکنی شعراء کا ایک اہم تذکرہ ہے اور زبان اور اسلوب کے اعتبار سے بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ اسد علی خاں تمنّا کی زبان اُس دور کے دوسرے تذکرہ نویسوں کے مقابلے میں بہت سلیس اور بے ساختہ معلوم ہوتی ہے۔ تذکرہ گل عجائب میں تمنّا نے کسی دوسرے تذکرے سے استفادے کا کوئی

اشارہ نہیں ملتا۔

تمؔنا نے تذکرے میں شعراء کے حالاتِ زندگی اور سیرت کے دونوں باتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ تمؔنا نے کہیں مختصر اور کہیں مفصل حالاتِ زندگی تحریر کئے ہیں اور ساتھ ساتھ ان سخنوروں کی سیرت کو بھی پیش کیا ہے۔ تمؔنا نے اپنے تذکرے میں بعض شعراء کو پہلی بار متعارف کروایا ہے جس کا ذکر اُس دور کے کسی تذکرے میں موجود نہیں ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تمؔنا نے بڑی محنت اور دلچسپی کے ساتھ یہ تذکرہ لکھا ہے اور اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ اپنے دور کے زیادہ سے زیادہ شعراء کو تذکرہ گل عجائب کے ذریعہ سے اردو داں طبقہ سے روشناس کروایا جائے۔ جب ہم تذکرہ گل عجائب کا مقابلہ اس دور کے دوسرے تذکروں سے کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اکثر جگہ فتوؔت، حمید اورنگ آبادی، فافشاں اور شفیؔق نے ایک دوسرے کے بیانات نقل کردیئے ہیں اور شاعروں کے حالات زندگی کی تفصیل کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ اس طرح بعض شاعروں کے نمونہ کلام کو بھی نہیں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف تمؔنا نے انتہائی عرق ریزی اور توجہ کے ساتھ شاعروں کے حالات زندگی کو ممکنہ حد تک مہیا کرنے کی کوشش کی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تمؔنا نے اشعار کے انتخاب میں بھی دوسرے تذکرہ نگاروں سے آگے نظر آتے ہیں اور کہیں مبتذل اشعار نہیں پیش کیا ہے۔ صرف انھیں اشعار کو اپنے تذکرے میں جگہ دی ہے جو ادبی اعتبار سے قابل ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمؔنا کا معیار نقد بلند تھا اور وہ اچھی ادبی بصیرت رکھتے تھے اور تمؔنا نے تذکرے گل عجائب میں شعراء کے کلام کا جو انتخاب کیا ہے اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے گل عجائب سے قبل لکھے گئے اورنگ آباد کے تمام تذکروں میں نقل کئے ہوئے اشعار کو نظر انداز کر کے خود اپنا انتخاب پیش کیا ہے اور اپنی پسند ناپسند اور اپنے تنقیدی ذوق کے اعتبار سے اشعار کو منتخب کیا ہے۔

تمؔنا کی تذکرہ نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں ''گل عجائب'' میں انھوں نے بعض شاعروں کی شخصیت، ان کے خدوخال اور ڈیل ڈوم وغیرہ کی طرف ایسے بلیغ اشارے کئے ہیں کہ شخصیت کی ایک دھندلی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ تذکرہ گل عجائب کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ تمؔنا نے صرف اُن ہی شعراء کو جگہ دی ہے جو ان کے ہم عصر تھے۔ خواہ ان کا تعلق شمالی ہند سے ہو یا حیدرآباد سے یا پھر اورنگ آباد سے۔

مرتب مولوی عبدالحق نے تذکرہ گل عجائب کے مقدمے میں کوئی تفصیل نہیں دی ہے اور نہ ہی کسی پہلو پر بحث کی ہے۔

مخطوطے کی کیفیت:

''تذکرہ گل عجائب'' ایک واحد نسخہ ہے۔ اور یہ مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ مخطوطے کے ابتدائی صفحہ پر ہی مخطوطہ کی سنہ تصنیف کا قطعہ درج ہے:

چو ایں تذکرہ رانمود وسم شروع
زحق است امید انمام او

تمنا بتاریخ سالش زمن
خر و گفت آغاز صفحہ لگو
1194ھ

اوراسی صفحہ پرآصفیہ "Hyderabd State Library" کی مہر ہے۔ اس کے اگلے صفحہ پر سرخ روشنائی میں ''رنگ دمزگل عجائب من المقالات الغرائب'' لکھا ہے۔ اس کے نیچے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور باب الالف سرخ روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔ مخطوطے میں موجود تمام سرخیوں کو سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ یہ مخطوطہ (144) صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر سطور کی تعداد مختلف ہے۔ اس مخطوطے کی ترتیب حروف تہجی سے کی گئی ہے اور یہ مخطوطہ 51 شعراء پر مشتمل ہے۔ ابتداء آرزؔو سے ہوتی ہے۔ آرزو کو حاشیہ میں سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ آرزؔو کی حالاتِ زندگی کے بعد فارسی کا کلام اس کے بعد اردو کا کلام ملتا ہے۔ اسد علی خاں تمنا نے جہاں سے اردو کے کلام کو شروع کیا ہے وہاں ''ہندی'' کو سرخ روشنائی سے لکھ دیا ہے۔

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں   زندگانی کا کہا بھروسا ہے

اس شعر کے بعد سرخ روشنائی میں ''عفان'' کا نشان لگا کر فارسی کا یہ جملہ اور یہ شعر حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

مرزا منعم کہ احوالش میر سدا ایں مضمون راخوب بستہ وبُرہان استحقاقِ ایں مضمون آوردہ۔

ہمارے پاس بی آیا نہ آیا   بھروسہ کیا ہے جی آیا نہ آیا

''انصاف''کوحاشیہ میں سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

مجکو دیتا ہے مگر آئینہ برداری کا کام　　　چشم بددور ان دنوں ماتھا چمکتا ہے مرا

اس شعر کے بعد یہ شعر لکھ کر قلمزدہ کر دیا گیا ہے۔

کہ شیخ ظلم سے ہوا اجدا کے طرف　　　انصاف ہر رسول کے اولاد کے طرف

افسر:

روشن نہ کیجو شمع کو زنہار دیکھنا
پروانہ سا جلونگا ابھی انجن کے بیچ

دیکھنا کا لفظ حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

عشق میں شیریں کے ناحق جی دیا اے کوہکن
کسی سے سیکھا تمہارے ظالم ایسی مرجانیکی طرح

ہم سے نہ پوچھ افسر بے دست و پا کو ہائے
کہ اہستا کہیں پڑا ہوگا وہ نیم جاں ہنوز

یہ دونوں شعر حاشیہ میں لکھے ہوئے ہیں۔

محمد سیف اللہ انور:

حاشیہ میں سرخ روشنائی سے لکھا ہوا ہے اور حضرت داور صاحب وقبلہ مدظلہ بھی حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔ محمد سیف اللہ انور کا فارسی کا یہ قطعہ حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

قطعہ ولہ:

عندلیبی بچمن گفت ضمیر دل خویش
حشت تدبیر اسرانی کہ دین عہد شباب

آشنائے بچمن طرح تکر دم و ذکر
در قفس کرم مرا خانہ صیاد خراب

گردید طرف مالب لعل مسی آلود
سر شدہ آحر زخجالت شفق گل

بوس لب شیریں کوہ بالجبر دشنام
ریند نہ چوقند وشکر اندر ورق گل (کذا)

آشفتہ:

''نواب عماد الملک مبارز خاں شہید کو حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

فصل گُل کیوں جہاں پر آئی عندلیبوں کی جان پر آئی
پھر مزا کیا رہا مرا صاحب بات جب امتحان پر آئی

گریباں چاک پھرتا ہوں مجھے کیا کام گلشن سے
دکھاتا ہے کسے اے باغباں نوں انتظام اپنا

رباعی

فریاد و فغاں کیا بہوت سا بسمل سن کر ہی گذر کیا نہ اودھر قاتل
ایک دم کے لئے خموشی بہتر ناداں دیجو نہ کسی کو دل اگر ہے عاقل

اوس پر برو کا دل دیوانہ ہے نہ فلک جس کا شیشہ خانہ ہے

یہ تمام اشعار حاشیہ میں لکھے ہوئے ہیں:

آصف: فارسی کا یہ شعر حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

گفت بود راخم ابرو سرشت قبلہ کیست
قبلہ من دل را بجرف نماید گفتن (کذا)

آصف کی حالاتِ زندگی، فارسی اور اُردو کلام کے بعد صفحہ 16 کو خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے اگلے صفحہ پر حسف البا، سرخ روشنائی سے لکھ کر بلال کا ذکر ملتا ہے۔

بیدار:

آتشِ حسرت پہ ہوجاتے ہیں لخت دل کباب
اوس لبِ می گوں سے جب کرنا ہے ساغر اختلاط

رات ہے ابھی باقی صبح ٹک نو ہونے دے
تجھکو گھر کے جانے کی ایسی کیا شتابی ہے

فروغ شمع ہو چوں پردۂ فانوس سے روشن
میرے سینہ سے یوں ہے آتشِ داغ جگر ظاہر

لفظ گوں سے جب کرنا ہے، رات ہے، میرے سینہ، یہ تمام الفاظ حاشیہ میں لکھے ہوئے ہیں۔

شاہ پنچھی پنچھی

شاہ پنچھی کی حالاتِ زندگی اور فارسی کا کلام نہیں ہے۔صرف اُردو کا کلام ملتا ہے۔اُردو کے کلام کے بعد تین صفحات کو ایسے ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔مخطوطے میں جرأت کے بعد خیال کا ذکر ملتا ہے۔حشمتؔ کا ذکر نہیں ملتا۔مخطوطے میں خیال کا ذکر دو جگہ ملتا ہے۔ پہلے صفحہ 31 (الف) اور صفحہ 35 (ب) پر۔ چونکہ تمنّاؔ نے تذکرے کو حرف تہجی سے ترتیب دیا ہے۔اس لحاظ سے صفحہ 31 (الف) پر خیال کا ذکر درست معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے صفحہ 35 (ب) پر تحریر کیا ہوا۔متن کو قلمز دہ کر دیا گیا ہے۔اس کے بعد صفحہ 34 کو خالی چھوڑ دیا گیا۔

دل۔

ذکاؔ......

رنگ پکڑے گا عجب کچھ دوستی کا گلستاں
دیکھتا ہوں اس طرف آتا اگر دل کا مزاج

مجھ سے دیوانے کی جب ٹھیری ہے مرنے میں صلاح
پوچھتے کیا ہے کو پھر تدبیر کرنے میں صلاح

آج کل اے کاروانِ اشک آنکھوں سے نکل
ہے تجھے دامن کی منزل پہ اوترنے میں صلاح

گلستان، دیکھتا ہوں، پھر تدبیر کرنے میں صلاح، آج کل اے کارواں، الفاظ پر سیاہی کا دھبہ آنے کی وجہ سے یہ اشعار نہیں پڑھ سکتے۔ یہاں پر مولوی عبدالحق نے قیاسی تصحیح سے کام لیا ہے۔

کیا کہوں میں تجھ سے کیفیت شبِ مہتاب کی
جس طرف دیکھو نظر آتا ہے بام و دَر سفید

حِنا نے خواں کا رقبہ کھو دیا خوبوں کے ہاتوں سے
کسے معلوم تھا ہووے کا یہ کچھ رنگِ کار آخر

سخت مشکل ہے رفو بیر ہنِ نازک کا
شاید اس وجہ رہی گل کی قبا چار ہنوز

تار سے زلفوں کی میں تیری اگر تشبیہ دوں
آسماں پر جارہے ہر شاخِ سُنبل کا دماغ

مشتاق ہورہا ہوں شہادت کا دلبر سے
پہنچے سلام خنجرِ جلاد کی طرف

شرم بھی اِن نازنینوں کی عجب کچھ چیز ہے
مرگیا دیکھ اوس حیا پرور کے شرمانے کا لطف

ہے غنیمت آج سیرِ گلستان کا اتفاق
پھر کیا ہم تم کہاں یہ دن کہاں کا اتفاق

یہ تمام اشعار حاشیہ میں لکھے ہوئے ہیں۔

اوس سرو ....
دیکھا تری رفتار کا
.... چلا دیکھو تم ہی
مسافر کے عیاں ہے سفری رنگ

اِن اشعار پر سیاہی کا دھبہ آنے کی وجہ سے یہ اشعار نہیں پڑھ سکتے۔

جس ہاتھ نے سو طرح مرے خوں کو ملا ہو

مہندی کے لگانے سے کہو کیونکہ بھلا ہے

ہما کے کیا گلے کا ہار ہو کوئی

یہ سایہ چیز کیا ہے جس کا منت دار ہو کوئی

جنوں کے ہاتھ سے ہم کیا کہیں دلِ سخت حیراں ہے

گریباں کر چکے ہیں نذر آگے اب یہ داماں ہے

تجھے واجب ہے جانا عرس میں اپنے شہیدوں کے

سنا ہوں میں کہ اون کا آج صندل کا چراغا ہے

یہ اشعار حاشیہ میں لکھے ملتے ہیں۔ ذکا کے اگلے ہی صفحہ پر محمد باقر کا ذکر لکھ کر قلمزدہ کر دیا گیا ہے۔ باقر کا ذکر مخطوطے میں دو جگہ پہلے صفحہ 31 (الف) بعد میں سالم کے ذکر کے ساتھ صفحہ 36 (الف) کے حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ

روتے تھے گل کو کانٹوں کی بھی اب تو باڑ گئی

ہو ہو خزاں چمن کے تئیں یوں اوجاڑ گئی

مخطوطے میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔ جبکہ مطبوعہ میں یہ شعر صفحہ 59 پر موجود ہے۔

سراج اور سالم کو حاشیہ میں سرخ روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔

جس طرح کھیت کو شاداب رکھے ہو شبنم

سبز ہو حُسن تیرا یوں عرق شرم کے سات

سونواں جوڑا قیامت ہے یہ تیرے بر میں آج

سچ بنانا خونِ عاشق سے کہا کا ہے رواج

سالمؔ کے ذکر میں یہ دونوں شعر صفحہ 40 (الف) میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد صفحہ 40 (ب) پر شعر:

نالہ خاطرِ خواہ گر کیجئے تو ایسا دم نہیں

بات کہہ کو بہلادیں تو کوئی محرم نہیں

اس شعر کے بعد یہ دونوں شعر اوپر نیچے لکھ کر کاٹ دیا گیا ہے۔

سوتواں جوڑا قیامت ہے یہ تیرے بر میں آج

سچ بنانا خونِ خونِ عاشق سے کہاں کا ہے رواج

جس طرح کھیت کو شاداب رکھے ہو شبنم

سبز ہو حُسن تیرا یوں عرف شرم کے سات

مخطوطے میں عاجز کا ذکر دو جگہ پر ملتا ہے۔ پہلے صفحہ 36 (الف) پر سالم کے اُردو کلام کے بعد عاجز کی مختصر حالاتِ زندگی کو لکھ کر قلمزدہ کر دیا ہے اور اسی صفحہ کے حاشیہ میں ''حرف الشین'' سرخ روشنائی لکھ کر باقر کی حالاتِ زندگی، فارسی اور اُردو کا کلام پیش کیا گیا ہے۔

شہید

قفلِ سخن را کلید مولوی محمد باقر شہید۔ تولاش در گجرات و از مدت مسکن و ماوا در خجستہ بنیاد اورنگ آباد و رزیدہ بتوکل توغل داشت۔ مرد صاحب کمال، صوفی مشرب و صافی مذہب بود، اکثر اعزہ از ذات تقدس صفاتش بہرہ برمیداشتند وراہِ لطالت گذاشتہ جادہ، ہدایت می پیمودند۔ از چندے شہید تیغ اجل گردیدو جا در سرائے خامد ۔شاد گزید۔ از وست۔

بہار درد کو اس غنچۂ دل میں تو مخفی رکھ

نہ کر پھر گل خرابی چہرۂ رازِ نہاں میرا

شہید اوراقِ ہستی جمع کرجوں بیڑہ پاں تو

یہ رنگیں بھیس سے شاید کہ لعل یار کو پہنچے

تو قانونِ عمل کا تار مت توڑ

کمر طاعت سے خم کر چنگ ہوجا

شہید اس نفس کافر کیش کو مار

حقیقت کا مظفر جنگ ہوجا

(صفحہ 36 (الف)

صفحہ 36 (ب) پر سرخ روشنائی سے 'حرف الضادٗ لکھ کر ضیا کی حالات زندگی، فارسی اور اُردو کا کلام کو تحریر کیا گیا ہے۔ ضیاء کے بعد 'حرف طٗ لکھا چند صفحات کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا ہے، ممکن ہے اسد علی خاں تمنآ اس حرف میں بھی شاعروں کے حالات زندگی اور نمونہ کلاس پیش کرنا چاہتے تھے۔ مگر کسی وجہ سے ان کو شامل نہ کر سکے۔ اس کے بعد عاجزؔ، عشرت، عروجؔ، عزلت، فتوت، فضلی، فخر دیں، قدرؔ کا ذکر ملتا ہے۔

کاظم:

کاظم کا یہ شعر حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

لام زلف و الف قد کو ترے دیکھ صنم
صفحۂ حُسن یہ گو تین کے میں کھینچا

نجم خان نجم: کے ذکر میں درقلعہ راک بلدہ دارالسرور برہان پور، حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

یار پہلو میں آ سمایا ہے
دیکھو اسوقت کیا سمایا ہے

یہ شعر حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

اسی صفحہ پر یعنی 70 (ب) Hyderabad Sate Library کی مہر درج ہے۔

صفحہ 71 (ب) پر سرخ روشنائی ''ورق حرف'' اور درا بجاتی یا تہ حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔

مخطوطے کے آخر صفحہ یعنی 73 (الف) پر ''ممتاز جنگ بہادر یار لکھ کر تھوڑی جگہ کو ایسے ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اُردو کا کلام موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے اسد علی خاں تمنا اُس جگہ پر فارسی کا کلام پیش کرنا چاہتے تھے۔ اسی صفحہ پر Hyderabad State Library کی تین مہریں درج ہیں اور اسی صفحہ کے دائیں بازو مخطوطے کے داخلہ کا نمبر درج ہے اور اسی کے نیچے حاشیہ میں یہ قطعہ درج ہے۔

ہزار شکرِ جناب مولیٰ کہ تذکرہ شو تمام اکنوں
درو د بر ختم مرسلیں و بر آل و اہل بیت او ہم
برائے تاریخ سال ختمش چو بود در دلِ مرا تمنآ
گل عجائب شگفت نیکو بگلبنِ سادہ گفت طبعم
1196ھ

اوراسی آخر نیچے یہ قطعہ درج ہے۔

تذکرۂ شاعراں شد چو تمام ایں زماں
شد دل و جان حزیں منبج و شادماں

داشت تمنا دلم فکر بتاریخ او
آمدہ آو نہ غیب شکر خدائے جہاں
1194ھ

حوالے

1- ''میر اسد علی خاں تمنا حیات اور ادبی کارنامے''۔ڈاکٹر مہر جہاں 1984ء ص 9

2- ایضاً ص 9

3- تذکرہ گل عجائب ''اسد علی خاں تمنا''، مرتب مولوی عبدالحق 1932ء ص 13

4- ایضاً ص 51

5- ایضاً 16

6- ''میر اسد علی خاں تمنا حیات اور ادبی کارنامے'' ڈاکٹر مہر جہاں 1984ء ص 57

7- کلیات امتیاز۔مرتب ڈاکٹر احمد علی شکیل 2005ء ص 11

8- ایضاً ص 11-10

9- مضمون ''دکن کی پہلی غزل گو شاعرہ''، ایم معین الدین۔غیر مطبوعہ مضمون۔

10- ''میر اسد علی خاں تمنا حیات اور ادبی کارنامے'' ڈاکٹر مہر جہاں 1984ء ص 115

11- کلیات امتیاز، مرتب ڈاکٹر احمد علی شکیل 2005ء ص 18-17

12- ایضاً ص 17

13- ایضاً ص 14

14- ''میر اسد علی خاں تمنا حیات اور ادبی کارنامے'' ڈاکٹر مہر جہاں 1984ء ص 106

15- ایضاً ص 74

16- کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات (جلد اول)۔نصیر الدین ہاشمی 1961ء ص 70

17- مخطوطات انجمن ترقی اُردو (جلد چہارم) مرتبہ افسر صدیقی امروہوی، سید سرفراز علی رضوی۔
1976ء ص 149

18- ایضاً ص 150

19- کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، نصیرالدین ہاشمی 1957ء، ص404-405

20- تذکرہ ''گلشن گفتار''۔ حمید اورنگ آبادی مرتب ایم کے فاطمی 1963ء ص20

21- ایضاً ص19

22- ''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری 1972ء ص134

23- ایضاً153

24- ''لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے'' سید محمد رضا ساجد رضوی 1990ء ص45

25- کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات (جلد اول) نصیرالدین ہاشمی 1961ء ص265

26- کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات (جلد اوّل) نصیرالدین ہاشمی 1961ء ص265

27- ''گل عجائب'' اسد علی خاں تمنّا، مرتب مولوی عبدالحق 1936ء ص6

28- ''تذکرہ گل عجائب'' اسد علی خاں تمنّا، مرتب مولوی عبدالحق 1936ء ص6

29- ایضاً ص

30- ایضاً ص8

31- ایضاً ص4

32- ایضاً ص9

33- ایضاً ص15

34- ایضاً ص52

35- ایضاً ص52-53

36- ایضاً ص98

37- ایضاً122

38- ایضاً ص129

باب سوم

مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی تذکرے

(ب) چمنستان شعراء

شفیق کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے جداعلیٰ لاہور کے رہنے والے تھے۔ شفیق کے دادا بھوانی داس پہلی بار اورنگ زیب کے لشکر میں شامل دکن آئے اور اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے۔ بھوانی داس کے منجھلے بیٹے رائے منسارام جو آصف جاہ اول کے عہد میں پیشکار تھے اور چھ صوبے اُن کی نگرانی میں تھے۔ یہ وہی منسارام ہے جن کو تاریخ وانشاء کا بھی ذوق تھا۔ اُن کی تصانیف میں ماثر نظامی 1200ھ اور قانون دربار آصفی 1185ھ جس کو ''ضوابط آصف جاہ'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ شفیق کے افرادِ خاندان میں اُن کے ایک بھائی روپ نرائن کا حال بھی ملتا ہے۔ یہ شفیق سے چھوٹے اور اُردو و فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ذہیںؔ تخلص استعمال کرتے تھے۔ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی تصنیف ''دکن میں اُردو'' میں ذہین کی ولادت 1192ھ لکھی ہے جبکہ شفیق نے تذکرہ ''گل رعنا'' میں ذہیںؔ کی سوانح حیات اور شاعر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بتاریخ بست و چہارم جمادی الاول سنہ اثنین وستین ومانہ والف 1162ھ روز دوشنبہ وار دِشبستانِ وجود شو، آثار رشد وسعادت از ناصیہ او بیدا است از درگاہِ امیر الممالک آصف الدولہ مرحوم بہ منصوبے سرافرازی دارد و در منصب ''دولے چند'' نام اوست بہ مشق شعر نو در آمدہ فکر خود را از نظرِ اصلاح آزادؔ مدظلہ العالی و خان صاحب ذکا سلمہ اللہ تعالیٰ می گذراندان شا اللہ رفتہ رفتہ ترقی خواہد کرد حق سبحانہ وتعالیٰ از عمر و دولت بہرہ مند ساز داز دست''۔

چو دستش را کند رنگیں حنا آہستہ آہستہ
کند پرواز رنگ از روے ما آہستہ آہستہ

خداوندا مگر بیمار شد از دوریِ ایں رہ
کہ از کویش رسد باد صبا آہستہ آہستہ

ہم جو قمری در جہان شادیم ما
باوجودِ طوق آزاد یم ما

یادِ ما تصویر جانان می کشد
عشق می داند کہ بہزاد یم ما (۱)

رائے منسارام کے دوسرے بیٹے کا نام شفیق ہے۔ شفیق کا پورا نام ''لچھی نارائن ماتھر'' (۲) ہے۔ شفیق 2 صفر 1158 ھ 1745ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن نصیرالدین ہاشمی نے اپنی تصنیف ''دکن میں اُردو'' اور ''دکنی ہندی اور اُردو'' میں شفیق کی سنہ پیدائش 1157 ھ لکھی ہے جبکہ تمام تذکرے اور خود شفیق نے اپنا تذکرہ ''چمنستان شعراء'' اور ''تذکرہ گل رعنا'' میں اپنی ولادت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بتاریخ دوم شہر صفر المظفر سنہ ثمانیۃ و خمسین و مائۃ والف اہجری'' (۳)

شفیق کی ابتدائی تعلیم رواجِ زمانہ کے مطابق عربی اور فارسی میں ہوئی۔ بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ ابتداء میں ''صاحب'' تخلص استعمال کرتے تھے۔ مگر استاد غلام آزاد بلگرامی کے کہنے پر ''شفیق'' تخلص اختیار کیا۔ خواجہ حمیدالدین شاہد نے مرتب مثنوی ''تصویر جاناں'' میں شفیق کے استاد اور تخلص پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس دور کے ایک بہت بڑے عالم، مورخ اور شاعر میر غلام علی آزاد بلگرامی سے شاعری اور دیگر علوم میں فیض حاصل کیا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ فارسی کے ایک شاعر میر محمد مسیح کا تخلص بھی صاحب ہے تو اُنھوں نے اپنے استاد آزاد بلگرامی سے نئے تخلص کی التجا کی۔ چنانچہ آزادؔ نے ازراہِ شفقت شفیق تخلص عنایت فرمایا۔ اس نئے تخلص کی تاریخ خود شفیق نے ''تخلص نو'' نکالی ہے جس کے اعداد سے 1176 ھ برآمد ہوتے ہیں''۔ (۴)

جہاں تک شفیق کے اساتذہ کا سوال ہے، تین اساتذہ جس میں شیخ عبدالقادر اسامی، شیخ عبدالقادر مہربانؔ اور غلام علی آزاد بلگرامی ہے۔ مولوی عبدالحق نے مرتب تذکرہ چمنستان شعراء کے مقدمے میں شفیق کے پہلے استاد شیخ عبدالقادر صاحب لکھا ہے۔ یہ دراصل شیخ عبدالقادر مہرباںؔ ہیں۔ مہرباں 1150 ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور شاعری میں آزاد بلگرامی کے شاگرد بھی تھے۔ (۵) سید محمد رضا ساجد رضوی نے اپنی تصنیف ''لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے'' میں شفیق کے پہلے استاد ''سامی'' کو بتایا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''شفیق کے پہلے استاد سید عبدالقادر سامیؔ ہی ہیں۔ عبدالقادر مہربانؔ بھی سید تھے اور عمر کے اعتبار سے وہ شفیق سے صرف آٹھ سال بڑے تھے اس لئے کسی اعتبار سے ان کو شیخ نہیں لکھا جا سکتا''۔(٦)

اگر شیخ عبدالقادر سامیؔ شفیق کے پہلے استاد ہوتے تو شفیق اپنے تذکرے چمنستان شعراء میں اُن کا ذکر ضرور کرتے لیکن شفیق نے کبھی بھی اُن کا ذکر استاد کے طور پر نہیں کیا اور خود اُنھوں نے اپنے تذکرے میں سامی کا نام ''شاہ غلام قادری سامیؔ'' لکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جس زمانہ میں آپ برار تشریف لائے تھے تو راقم الحروف نے دو شعر لکھ بھیجے تھے۔ خجستہ بنیاد میں آئے تو راقم نے ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ آپ نے بھی غریب خانہ پر کئی بار آنے کی زحمت گوارا کی''۔(٧)

شفیق کے ایک اور استاد غلام آزادؔ بلگرامی ہیں، مولوی عبدالحق مرتب تذکرہ چمنستان شعراء کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''میر غلام علی آزاد 1152 ھ 1740 ء میں اورنگ آباد وارد ہوئے اور بابا شاہ مسافر کے تکیے میں قیام کیا اور سات سال یہی بسر کر دیئے۔ آزاد کی عمر کے اڑتالیس سال دکن ہی میں گذرے اور یہیں وفات پائی اور خلد آباد میں پیوند خاک ہوئے۔ شفیق کو آزاد سے کمال عقیدت مندی تھی اور جہاں کہیں اُن کے تالیفات میں آزادؔ کا نام آیا تو اُن کا ذکر بڑے ادب و احترام اور خلوص و ارادت سے کرتے ہیں اور ہر جگہ انھیں ''میر صاحب قبلہ''، پیرومرشد یا قبلہ و کعبہ برحق اور اپنے کو ''غلام'' لکھتے ہیں''۔(٨)

میر غلام علی آزاد بلگرامی نہ صرف شاعر تھے بلکہ اپنے دور کے جید عالم اور صاحبِ تصنیف بھی تھے۔ آپ کی ولادت محلّہ میدان پورہ ضلع بلگرام میں 25 صفر 1116 ھ میں ہوئی۔(٩) آپ نہ صرف فارسی اور اُردو

کے شاعر تھے بلکہ عربی میں بھی اچھی مشق سخن رکھتے تھے۔ فارسی تاریخ گوئی پر خاص ملکہ حاصل تھا اور لاتعداد تاریخیں بھی کہی ہیں۔ آپ کا دیوان ''سبعہ سیارہ'' جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی تصانیف سرد آزاد، ید بیضی اور خزانہ عامرہ، غزالان ہند، شمامۃ الہندفی، ذکر الہند، سبحۃ المرجان اور شرح بخاری تا کتاب زکوۃ (۱۰) شامل ہیں۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جس میں آصف جاہ ثانی، نواب ناصر جنگ شہید، میر عبدالقادر مہرباں، عبدالوہاب افتخار، افضل بیگ فافشاں، غلام علی ارشد اور لچھمی نرائن شفیق تھے۔ شفیق کو اپنے استاد سے بے حد عقیدت تھی اور آپ کی شان میں کئی اشعار بھی کہے ہیں۔

لامکان است مقام آزاد   فوق عرش است خرام آزاد
سبحہ گردان زکواکب ہر شب   مُلک رہبر است بنام آزاد
خرمن ہستیٔ اعدا سوزو   برق رخشان حسام آزاد
در گلستان جہان ہر گل و خار   سو رد رحمت عالم آزاد
جدّ او ساقی کوثر باشد   آب خضر است بجام آزاد
گل شود گوش ہمہ تن بہ چمن   کہ برد باد پیام آزاد
پیش آئینہ ضمیر آن طوطی   می کند وصف کلام آزاد
اسے خداوند جہاں با دمدام   ساغر عیش بکام آزاد
صاحب ہر دو جہاں ست شفیق   ہر کہ گردید غلام آزاد (۱۱)

غلام علی آزاد بلگرامی نے 81 سال کی عمر میں 1200ھ میں اورنگ آباد میں انتقال کیا۔ (۱۲)

کوئی بھی شاعر ہوں یا ادیب اُس کی شخصیت اور ادبی اہمیت کا اندازہ اُس کے معاصرین سے ہوتا ہے۔ بغیر معاصرین کے اُس کے مقام اور مرتبہ کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ شفیق کا تعلق دکن سے تھا اور اُس وقت دکن میں سلطنت آصفیہ کا قیام ہو چکا تھا۔ سلطنت آصفیہ کے دور میں کئی شاعر اور ادیب گذرے ہیں جن میں نورالدین علی خاں رنگیں، مہر علی مہر، مرتضٰی مہدیؔ، مرزا مغل کمتر، مرزا عطا ضیاؔ، شاہ فضل اللہ فضلی، میر عبدالحئی خاں، خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت، لالہ چند رنگیں، صمصام الملک صارمؔ، الفت خاں مبتلا، مرزا جمال اللہ عشق، شیخ ظہورالدین نادرؔ، عنایت اللہ فتوت، اسد علی خاں تمنؔا، موہن لال مہتاب، انصاف ہمدانی اور لچھمی نرائن شفیق

ہیں۔ دراصل سلطنت آصفیہ اُس وقت علم وادب کا ایک اہم مرکز بنا ہوا تھا اور کئی شعراء اور ادیب اسی علمی چہل پہل اور شعر وسخن کی سرگرمیوں کی وجہ سے یہاں جمع ہو گئے تھے۔ جہاں تک شفیق کے معاصرین کا سوال ہے اُس میں دو گروپ تھے۔ ایک وہ جو اُس وقت حیدرآباد میں موجود تھے۔ دوسرے وہ جو اورنگ آباد سے منتقل ہو کر حیدرآباد آ گئے اور ہمیشہ کے لئے یہیں بس گئے۔ اُس وقت حیدرآباد میں نقد علی خاں ایجادؔ، فتح یاب بیگ خاں انجمؔ، شاہ عبداللہ احقر، میر عباس علی خاں احسانؔ، محمد پیاہؔ، میر دوست علی، میر محمد میر، لالہ نہاں کرن داغؔ، عیش مرزا اکبر بخشؔ، میر سراج الدین سراجؔ، میر قاسم خاں عاشقؔ، عنایت اللہ فتوتؔ، میر ہاشم فقیرؔ، میر قلاںؔ، مہر علی مہرؔ، الفت خاں مبتلاؔ، میر مقصودؔ، لالہ موہن لال مہتابؔ، شیخ نورالدین نادرؔ اور نور منورالدولہ یارؔ ہیں۔ جن سے شفیقؔ کے دوستانہ تعلقات تھے اور شفیق نے تذکرہ چمنستان شعراء میں اپنے معاصرین کا ذکر بڑی عقیدت مندی کے ساتھ کیا ہے۔ شفیق اپنے زمانے کے اساتذہ استاذ گذرے ہیں مگر اُن کے شاگردوں کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ صرف مثنوی تصویر جاناں مرتب خواجہ حمید الدین شاہد نے ایک شاگرد غلام مصطفےٰ سخن اورنگ آبادی کا ذکر کیا ہے۔

1134 ھ میں آصف جاہ اول نے اورنگ آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اُن کے انتقال کے بعد ناصر جنگ شہید تخت نشین ہوئے۔ ناصر جنگ کا شمار اُس دور کے شعراء میں ہوتا ہے۔ اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ناصر جنگ شہید کے دور کے شاعروں میں سراجؔ، آزاد بلگرامیؔ، ولیؔ، معظم خاں محرمؔ، مرزا نقی علی خاں ایجادؔ، نور محمد عاصی، عاجزؔ اور عزلتؔ گزرے ہیں۔

ناصر جنگ شہید کی شعر وادب سے دلچسپی کی وجہ سے اورنگ آباد ادب کا ایک اہم مرکز بنا ہوا تھا مگر 1176 ھ میں ناصر جنگ اور صلابت جنگ کے بعد آصف جاہ اول کے چوتھے بیٹے نظام علی خاں تخت نشین ہوا تو اُس نے سیاسی مفادات کے پیش نظر 1184 ھ 1768 ء میں اورنگ آباد کے بجائے حیدرآباد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ جس سے اورنگ آباد کے کئی شاعر اور ادیب حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ جس میں لچھمی نرائن شفیقؔ بھی شامل تھے۔ شفیق نے اپنی ملازمت کی ابتداء نواب نظام علی خاں 1175 ھ سے 1218 ھ (۱۳) کے دربار سے وابستہ ہو کر کیں۔ اس کے بعد صمصام الدولہ کے عہد میں ''دولت چند'' کے منصب اور خطاب سے سرفراز ہوئے۔ جس کا ذکر شفیق نے تذکرہ ''گل رعنا'' میں کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''در اقتدار نواب صمصام الدولہ مرحوم بہ منصب و خطاب

''دولت چند'' سرفراز شد۔(۱۴)

صمصام الدولہ کے بعد نواب نظام علی آصف جاہ ثانی اور پھر اُن کے بیٹے نواب امیر احمد خاں کے دربار سے منسلک ہوئے اور اسی دور میں ''تذکرہ گل رعنا'' اور تذکرہ شامِ غریباں جیسی کتابیں لکھیں۔ شفیق 65 سال کی عمر میں 1223 ھ 1808 ء کو حیدر آباد میں رحلت فرمائی۔ اُن کے شاگرد غلام مصطفےٰ سخن اورنگ آبادی نے قطعہ تاریخ کیا ہے۔

استاد من شفیق افسوس — از سپنجی سرائے فانی رفت

روئے دل از کسے نمی یتیم — مایۂ لطف و مہربانی رفت

از حلاوت گذشت نظم و نثر — نمک از شعر و شعر خوانی رفت

سالِ رحلت رقم کرد سخن

وائے مشاطہ معانی

رفت(۵۱)

1223 ھ

شفیق اپنے دور کے شاعر، نثر نگار اور مورخ بھی گذرے ہیں۔ گیارہ سال کی عمر سے شعر کہتے تھے۔ شفیق نے غزلوں کے علاوہ قصیدے، شہر آشوب، داسوخت، مثلث، مخمس، رباعیات، تضمین اور مثنویاں بھی کہی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے مرتب چمنستان شعراء کے مقدمے میں کہیں بھی شفیق کی مثنویاں اور قصیدوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر لئیق صلاح نے شفیق کی تین مثنویاں، مثنوی تصویر جاناں، مثنوی میخانہ عاشقی، مثنوی زرا اور کھونچگھی اور قصیدہ در جواب سوداؔ، اور ایک لغت ''سوسنِ دہ زبان'' کا ذکر کیا ہے۔ شفیق کی سب سے اہم مثنوی ''مثنوی تصویر جاناں'' ہے جس کو شفیق نے 1188 ھ میں لکھی۔ اس مثنوی کو پہلی مرتبہ مولوی ابوعمر یافعی نے حیدر آباد کے سہ ماہی رسالہ تجلی جلد (2) بابت جنوری 1928 ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد خواجہ حمیدالدین شاہد نے 1957 ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ حیدر آباد سے شائع کیا۔

افسر صدیقی نے شفیق کی ایک اور مثنوی ''توشۂ آخرت'' کا تعارف رسالۂ قومی زبان کراچی گسٹ 1968 ء میں کرایا تھا۔ مثنوی کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مثنوی کا مخطوطہ ناقص الطرفین ہے اور آب زدگی کی وجہ سے
بعض الفاظ ایسے ہوگئے ہیں کہ انھیں صحیح پڑھنا مشکل ہے۔ معلوم نہیں
مصنف نے اس مثنوی کا نام کیا رکھا تھا۔ لیکن ہم نے مثنوی کی اس بہت
سے مثنوی نوشۂ آخرت نام اخذ کیا ہے۔
یہ ہے مثنوی توشۂ آخرت۔ یہ ہے رہبر گوشۂ آخرت
مثنوی نوشتہ آخر کا سائز 5x½ اور صفحات 74 ہیں۔ سطر 14
سطور کا ہے۔ کل ابیات موجودہ صورت میں 1017 کو ہیں''۔(١٦)

شفیق ایک مورخ بھی تھے۔ تاریخ پر ان کی کتابیں ''تمیق شگرف'' 1200 ھ، ''حقیقت ہائے ہندوستان'' 1204 ھ، ''ماثر آصفی'' 1208 ھ، ''حالات حیدرآباد'' 1214 ھ، ''بساط الغنائم'' 1214 ھ، ''خلاصۃ الہند'' 1210 ھ، ''تحفۃ العالم'' 1203 ھ، ''حدیقۃ العالم''۔ اس کے علاوہ تین تذکرے ''چمنستان شعراء'' 1175 ھ مرتب مولوی عبدالحق 1927 ء، تذکرہ گل رعنا 1182 ھ مرتب نثار احمد فاروقی سنہ.....19، تذکرہ شام غریباں 1197 ھ مرتب محمد اکبرالدین صدیقی 1977 ء وغیرہ شامل ہیں۔

تذکرہ چمنستان شعراء سے پہلے اورنگ آباد میں کئی تذکرے لکھے گئے یا یوں کہیے کہ تذکرہ نگاری کی ابتداء 1165 ھ میں ہوچکی تھی۔ میر کا تذکرہ نکات شعراء کو اُردو کا پہلا تذکرہ قرار دیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُردو کا پہلا تذکرہ ''مخزن نکات'' ہے۔ نثار احمد فاروقی نے میر کے تذکرے پر قائم کے تذکرے کے تاریخی تقدیم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قائم کا تذکرہ یقیناً نکات الشعراء
سے پہلے مدون ہوچکا تھا۔ اگرچہ اس کی اشاعت 1168 ھ سے پہلے
نہیں ہوسکتی''۔(١٧)

تذکرہ ''مخزن نکات'' اُردو شعراء کا ایک قدیم تذکرہ ہے۔ جو فارسی زبان میں لکھا گیا۔ جو میر کا تذکرہ نکات الشعراء سے پہلے کا ہے۔ اختلاف تو ہر جگہ ہوتا ہے مگر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قائم نے 1157 ھ میں یعنی میر کے تذکرے نکات الشعراء سے آٹھ سال پہلے اپنے تذکرے کی ابتداء کی تھی اور 1168 ھ تک اُس

میں اضافے کرتے رہے۔ یہ تذکرہ 128 شعراء پر مشتمل ہے۔اس کے بعد شمالی ہند میں میر تقی میر کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' 1165ھ، تحفۃ الشعراء (فارسی شعراء) افضل بیگ فافشاں 1165ھ، ''گلشن راز'' یا تذکرہ ''ریختہ گویاں''، سید فتح علی خاں 1166ھ میں منظر عام پر آ چکے تھے۔اسی طرح دکن میں بھی کئی تذکرے لکھے گئے جن میں ''گلشن گفتار'' خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی 1165ھ، ''ریاض حسنی'' خواجہ عنایت اللہ فتوت 1168ھ، آزاد بلگرامی کے دو تذکرے ''خزانہ عامرہ''، ''سرو آزاد'' اور چمنستان شعراء لچھمی نرائن شفیق 1175ھ وغیرہ شامل ہیں۔

تذکرہ ''چمنستان شعراء'' اورنگ آباد کا ایک اہم تذکرہ ہے۔ جو فارسی زبان میں لکھا گیا۔اس تذکرے کی سنہ ترتیب میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ کیوں کہ شفیق نے تذکرہ چمنستان شعراء کے دیباچے کے آخر میں اس تذکرے کا قطعہ تاریخ لکھ دیا ہے۔

این نامہ را باید دیدن — کردم انشا حال قصحا

نام و نار یاخش را صاحب — گفتم ''چمنستان شعراء''

1175ھ

تذکرہ چمنستان شعراء 212 شعراء پر مشتمل ہے۔ شفیق نے اس تذکرے کو حروف تہجی کے بجائے حروف ابجد یعنی حساب جمل کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ یہ روایت دراصل عربی سے زیادہ فارسی، فارسی سے اُردو میں مقبول عام رہی۔ شفیق نے اس تذکرے کی بنیاد میرؔ کا تذکرہ نکات الشعراء اور فتح علی گردیزی کا تذکرہ ''ریختہ گویاں'' پر رکھا ہے جس کا ذکر شفیق دیباچے میں کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''درین اثنا تذکرہ نکات الشعراء میں تصنیف میر محمد تقی میر و تذکرہ فتح علی خاں تازہ از ہندوستان نزول نمودہ شواے در عالم انداخت، وجہاتے را دراشتیاق اشعار ہند کہ بہم رسیدن آن اہل دکن راخیلے دشوار است تہ وبالا ساخت، لہذا ابخاطر فاطر وفکر ناقص گذشت کہ خود ہم این ھمہ اشعار ہر دو تذکرہ گرفتہ و دیگرا ایکجا جمع ساختہ بطور سفینہ کے انیس یکتائی وہمدم تنہائی شود نقش باید ست''۔(۱۸)

تذکرہ چمنستان شعراء کو پہلی مرتبہ مولوی عبدالحق نے 1928ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی

اُردو اورنگ آباد دکن سے شائع کیا۔ مولوی عبدالحق کی مرتبہ تصنیف 565 صفحات پر محیط ہے اور اس مرتبہ تذکرے کا مقدمے صرف چار صفحات پر مبنی ہے۔ مقدمے میں کوئی تفصیلی بحث نہیں کی گئی اور نہ مقدمے میں مخطوطے کے کسی بھی پہلو پر کوئی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ فاضل مرتب نے چند باتوں کا ذکر سرسری طور پر کیا ہے۔ جبکہ تذکرہ چمنستان شعراء اورنگ آباد کے تذکروں میں ایک نمایاں خصوصیت کا حامل ہے کیوں کہ یہ تذکرے شمالی ہند اور جنوبی ہند کے شعراء پر مشتمل ہے اور اس تذکرے میں زیادہ تر شعراء شفیق کے ہمعصر ہیں۔ دوسرے تذکروں کے مقابلے میں شفیق نے تذکرہ چمنستان الشعراء میں تحقیق وتنقیدی نظ سے اس کو ترتیب دیا ہے۔ مولوی عبدالحق تذکرہ چمنستان شعراء کے مقدمے میں مخطوطے کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس تذکرے کا صرف ایک نسخہ ہے جو کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی حیدرآباد میں ہے اور یہ بھی کرم خوردہ، فرسودہ اور مشکوک ہے۔ یہ اسی نسخے کی نقل ہے۔ اس کی تصحیح میں بیحد دقت اُٹھانی پڑی۔ بعض عبارتیں اصل کتب سے جو اُس کا ماخذ ہیں صحیح کرنی پڑیں۔ کہیں قیاس سے کام لینا پڑا۔ اور بعض بعض مقام پر کچھ الفاظ جو کتاب کے ازلی دشمن کیڑے چٹ کر گئے ہیں ویسے ہی چھوڑنے پڑے اور ان کی جگہ نقطے دے دیئے ہیں بہت سے اشعار جو تذکرے میں مشکوک یا کرم خوردہ تھے۔ شعراء کے اصل دیوانوں سے تلاش کر کے لکھے گئے۔ بعض الفاظ جو مشتبہ تھے اور اُن کی صحت نہ ہوسکی اُس کے سامنے استفہام کی علامت لکھ دی گئی ہے"۔ (۱۹)

تذکرہ چمنستان شعراء ایک واحد نسخہ ہے جو آصفیہ لائبریری میں محفوظ ہے۔ فاضل مرتب نے مقدمے میں تذکرے کے صفحات، سطور، ترک ترقیمہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی تصنیف "کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات" (جلد اول) میں تذکرہ چمنستان شعراء کے مخطوطے کی کیفیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"نمبر تذکرہ اُردو (۷۷)، سائز (۹×۵)، صفحہ (۳۴۴)، سطر

(۱۷)، خطہ۔شکستہ، مصنف ۔لالہ لچھمی نارائن شفیق۔تاریخ تصنیف ۔

۱۱۷۵ھ''۔(۲۰)

شفیق نے چمنستان شعراء17 سال کی عمر یعنی1175ھ میں ترتیب دیا۔ کیوں کہ شفیق کی پیدائش 2 صفر 1158ھ ہے۔ مولوی عبدالحق نے تذکرہ چمنستانِ شعراء کے مقدمے میں تذکرے کی سنہ ترتیب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شفیق نے یہ تذکرہ اٹھارہ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور بغیر کسی کی مدد کے بہت تھوڑے عرصے میں ختم کر دیا۔اس عمر میں ایسی اچھی کتاب کی تالیف کرنا اعجاز سے کم نہیں۔اس سے شفیق کی غیر معمولی ذہانت اور لیاقت معلوم ہوتی ہے۔کتاب کا نام ''چمنستان شعرا'' تاریخی ہےاوراس سے سنہ 1175ھ سنِ تالیف نکلتا ہے۔(۲۱)

مولوی عبدالحق نے کوئی بھی حوالہ دیئے بغیر تذکرہ ''چمنستان شعراء'' کی تالیف کے وقت شفیق کی عمر اٹھارہ سال لکھی ہے۔جبکہ یہ صحیح نہیں ہے۔کیوں کہ ''چمنستان شعراء'' کی تالیف کے وقت شفیق کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اگر تذکرہ کی تالیف کو اٹھارہ سال صحیح تسلیم کرتے ہیں تو شفیق کی تاریخ پیدائش 2 صفر 1157ھ ہوگئی اور مولوی عبدالحق کی تحقیق کو بنیاد بنا کر نصیرالدین ہاشمی نے اپنی تصانیف ''کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات (جلد اول)، اور ''دکن میں اُردو'' میں شفیق کی سنہ پیدائش 1157ھ لکھی ہے اور اُس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالحق صاحب نے چمنستانِ شعراء کے مقدمے میں اُن کا سنہ پیدائش 1158ھ لکھا ہے اور چمنستان شعراء 1175ھ کی تصنیف ہے۔ظاہر ہے کہ یہ سنہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔اس سنہ کو کتابت کی غلطی بھی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ''مقدمات عبدالحق'' میں میں بھی یہی سنہ لکھا گیا۔خود مولانا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر اس تذکرہ کا ترتیب میں ہوئی۔اس لئے صحیح سنہ پیدائش

1157ھ ہے''۔(۲۲)

تذکرہ چمنستانِ شعراء212 شعراء پر مشتمل ہے۔شفیق نے چمنستان شعراء ترتیب دینے میں بہت عجلت دکھائی ہے۔وہی مرتب فاضل نے اس تذکرے کو مرتب کرنے میں بھی عجلت دکھائی ہے۔کیوں کہ شفیق نے تذکرے میں نقد علی خاں آبجا کے حالات زندگی کو دو مختلف مقامات پر تحریر کیا ہے۔پہلے صفحہ 34 پر آزاد بلگرامی کا تذکرہ''سروآزاد'' کے حوالے سے اور صفحہ 42 پر فتح علی گردیزی کا تذکرہ''تذکرہ ریختہ گویاں'' کے حوالے سے۔ہوسکتا ہے کہ آزاد بلگرامی نے خطاب''نقد علی خاں'' اور تخلص ابجؔاد سے ان کی حالات زندگی قلمبند کی ہو اور فتح علی گردیزی نے ان کے خطاب کے بجائے نام اور تخلص سے اُن کے حالات لکھے ہوں۔کیوں کہ شفیق کے سامنے یہ دونوں تذکرے موجود تھے اور اُنھوں نے بنا کسی معلومات کے دونوں کو تذکرہ چمنستان شعراء میں نقل کر دیا۔جبکہ نقد علی خاں ابجؔاد دو الگ الگ شخصیتیں نہیں بلکہ ایک ہی ہے۔جس کا ذکر تمؔنا نے تذکرہ گل عجائب میں تفصیل سے کیا ہے۔

''گوہر صدفِ فصاحت ناوک ہدفِ بلاغت درفنِ گفتگو استاد نقد علی خاں ابجاد۔ازقومِ ناچار، نام اصلی اُومیر علی نقی، حلف الصدق نقد علی خاں مرحوم ہمدانی، کہ با شیخ علی خاں وزیرِ شاہ سلیمانی صفوی بقرابتِ قریبہ مشہور بود۔ودرعہد آصفجاہ طاب ثراہ بدیوانئ بادشاہی فرخندہ بنیاد مہ تے مامور بود۔درآں زماں خان ابجاد۔تیز بسیار قرب ومصاحبتِ نواب داشت، و بخدمتِ کوتوالِ لشکر سرافراز بود، بعد وفاتِ والد بخطات دیوانی موروثی سرافتخار برافراخت۔بعدش بدار وغگی فیلخانہ سرکار نواب صلابت جنگ سربلند گردیدہ ودرعصرِ نواب نظام الدولہ فتح جنگ بہادر بہ خدمت اتالیقی صاحب زادۂ بلند اقبال انتظام الدولہ نصرت جنگ بہادر چندے سرگرم بود''۔(۲۳)

تذکرہ''چمنستان شعراء'' کو مولوی عبدالحق نے 1928ء میں تذکرہ''گل عجائب'' کو 1932ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔دونوں تذکروں میں نقد علی خاں ابجؔاد کا ذکر موجود ہے۔فاضل مرتب نے اُن پر غور کئے

بغیر ہی یوں ہی نظر انداز کر دیا۔ نقد علی خاں ابجؔاد دراصل آصف جاہی دور کے باکمال اور کہنہ مشق شاعر گذرے ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے نصیرالدین نے اپنی تصنیف ''کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات'' (جلد اول) میں ابجؔاد کے کلیات کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مرزا علی نقی خاں نام نقد علی خاں خطاب اور ابجاؔد تخلص آصفی دور کے باکمال اور کہنہ مشق ہیں''۔(۲۴)

نصیرالدین ہاشمی نے اپنی دوسری تصنیف ''دکن میں اُردو'' میں نقد علی خاں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مرزا علی نقی خاں نام، ابجاؔد تخلص اور نقد علی خاں خطاب تھا۔ خاندان قاچار سے تھے۔ سلیمان صفوی کے وزیر شیخ علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ آصف جاہ اول کے زمانہ میں اُن کے باپ نقد علی خاں دیوانی بادشاہی میں ملازم تھے۔ ابجاد بھی اسی زمانہ میں مامور ہو گئے۔ اولاً کوتوال لشکر اور پھر باپ کی خدمت ملی۔ صلابت جنگ کے زمانے میں داروغہ خانہ اور آصف جاہ ثانی کے عہد میں صاحبزادہ نواب انتظام الدولہ نصرت جنگ کے اتالیق بھی مقرر ہوئے۔ 1194ھ میں حیدرآباد میں گوشہ نشین تھے''۔(۵۲)

مولوی عبدالحق کی تحقیق کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی تصنیف ''اُردو تذکرہ نگاری'' میں چمنستان شعراء میں شاعروں کی تعداد 213، ڈاکٹر حنیف نقوی نے بھی اپنی تصنیف ''شعرائے اُردو کے تذکرے'' میں شعراء کی تعداد 213 ہی دی ہے۔ جبکہ سید محمد نے اپنے مضمون ''شفیق لچھمی نارائن 1158ھ تا 1215ھ'' میں چمنستان شعراء کے شاعروں کی تعداد 218 لکھی ہے۔

اورنگ آباد کے تذکروں میں شفیق کا تذکرہ ''چمنستان شعراء'' ایک اہم تذکرہ ہے۔ تذکرہ چمنستان شعراء کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شفیق ایک بڑے محقق تو نہیں مگر تحقیق کا حق ضرور ادا کیا ہے جہاں اُنھوں نے شعراء کے حالاتِ زندگی کو نہ صرف روایتوں کے سہارے قلمبند کیے۔ وہی اُن واقعات کی چھان بین بھی کی ہے اور اُن ماخذوں تک پہنچنے کی پوری پوری کوشش کی ہے اور شفیق نے تذکرے میں شعراء کے کلام پر

اصلاح بھی کی ہے۔ زکی کے اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں:

سجن کے دیس کیا پہنچی ہے بے ہوشی نہایت کو
دے آیا بھول کر قاصد کتابت جانیابت کو

فتح علی خاں گردیزی نے اس شعر کو ولی کا بتایا ہے جبکہ شفیق نے تذکرہ چمنستان شعراء میں اس شعر کو ولی کا نہیں بلکہ زکی ہی کا بتایا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اعنے گویند این شعر از ولی ''دکھنی است'' صاحب، میگوید دیوان ولی بنظر درآمد، ابن بیت در و داخل نیست۔ تحقیق کہ از زکی است''۔(۲۶)

شفیق نے زکی کے اس شعر کی اصلاح کی ہے۔

دل میں آولے سو کرو اب نو گرفتار ہوا
میں تو تحقیق محبت کا گنہ گار ہوا

لکھتے ہیں:

''مصرع اولیٰ خلاف محاورۂ نکتہ چینان است، اگر چنین می گفت خوب بود''۔(۲۷)

دل میں کیا ہے سو کہو اب نو گرفتار ہوا
میں تو تحقیق محبت کا گنہ گار ہوا

ولی کے اس شعر کی اصلاح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اے زہرہ جبیں کش کرے مکھ کی کلی دیکھ
گاتا ہے ہر یک صبح میں اُٹھ رام کلی کو

''اگر بجائے ''گاتا ہے'' کہتا ہے'' می گفت، این شعر درست میشد واز زبان حرف گیران نجات می یافت''۔(۲۸)

حزین کے اس شعر پر فتح علی گردیزی نے اعتراض کیا ہے۔

فرش ہوجاتا ہوں سنگِ آستاں میرے کو دیکھ
طور کا کرتے تھے جیسے حضرت موسیٰ ادب

بقول فتح علی خاں:

''مخفی نماند کہ دندوت حرف ہندی است، سجدہ رامی گویند کہ
بجر ددیدن بابت خانہ پیش اونگون شدہ دیدارکنندہ سجدہ می کنند''۔(۲۹)

خال کے اسودحجر کا یوں ادب کرتا ہوں میں طور کا کرتے تھے جیسے حضرت موسیٰ ادب اورآ گئے شاہ سامؔی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احوال ایشان بقلم می آبد، این اوراق رامطالعہ کردندو گفتند کہ
فرش رااستعارہ بروجود......ادب کردہ است، اگرچنین می گفت مضمون
جناب ادامی شد''۔(۳۰)

یوں ادب کرتا ہوں سنگ آستاں تیرے کو دیکھ
طور کا کرتے تھے جیسے حضرت موسیٰ ادب

حاجؔی علی اکبراماں نے اپنی غزل میں لفظ بوسفتستان استعمال کیا ہے۔تو لوگوں نے اُس پر اعتراض کیا ہے۔

مجھ سے بولا دیکھ کر دل نے دبستان کی بہار
مکتبوں میں ہند کے ہے بوسفستان کی بہار

شفیق لکھتے ہیں:

''بعضے مردمان معنیٰ ناشناس بیگانہ ازسخن فہمی، اعتراض بر لفظ
بوسنستان می آرند،محض باطل است''۔(۳۱)

سامؔی نے حاجؔی کے اس مصرے کی تضمین کے طور پر استعمال کیا ہے۔شعرملاحظہ ہو:

مصر میں سامؔی ، نہ جا سن ، حاجی اکبر کا سخن
مکتوب میں ہند کے ہے بوسفستان

شفیق نے بھی اس مصرعہ کو بطور تضمین کے باندھا ہے۔غزل ملاحظہ ہو:

ہے نظر میں میرے اس گل کی دبستان کی بہار — جس طرح بلبل کو یاد آتی ہے بستان کی بہار
طفل آنسو کو مرے یک پل نہیں دل بیچ چین — کب خوش آتی ہے اُسے تجھ بن گلستان کی بہار
ہے سطر ہر ایک میری رشک زلف گل رخاں — کب برابر اُس کے ہے گی نسبلستان کی بہار
چاہ کنعاں کی عبث ، صاحب سخن جامی کا سن — ''مکتوب میں بند کے ہے یوسفستان کی بہار''

جہاں شفیق نے شعراء کے اشعار پر اصلاح کی ہے وہیں کئی شاعروں کی تاریخ وفات کے قطعات بھی درج کئے ہیں جیسے۔

ا۔آرزو:1169ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔اوران کی وفات پر میر نے قطعہ کہا تھا:

''بگو آں جانِ معنیٰ آرزو رفت''
1169ھ

۲۔امید:1159ھ میں اکبرآباد میں فوت ہوئے جس پر میر نے تاریخ وفات کہی تھی۔

''جاں داد کی قزلباش خاں''
1159ھ

۳۔بیدل:3صفر1133ھ۔میر نے تاریخ کہی تھی:

''میرزا بیدل ازیں عالم رفت''
1133ھ

۴۔خسرو:آپ کی وفات25ہجری میں شب جمعہ کو74سال کی عمر میں ہوئی۔
تاریخ وفات کا قطعہ

شد عدیم المثل'' یک تاریخ او
دیگرے شد''طوطی شکر مقال''

۵۔داؤد:مرزاداؤد کی 1157ھ میں وفات ہوگئی۔راقم نے تاریخ کہی:

''برفتہ میرزا داؤد از فانی جہاں''
1157ھ

۶۔رنگین: رنگین 1170ھ میں فوت ہو گئے۔میر مہربانؔ نے تاریخ وفات کہی:

1170ھ

۷۔شورش: 1172ھ میں رحلت کر گئے۔راقم نے تاریخ وفات کہی۔

''مرگیا آہ شورشِ ہمدم''

1172ھ

۸۔گرامیؔ: 1156ھ میں انتقال ہوا۔تاریخ وفات

رندے عجبے ازیں جہاں رفت''

1156ھ

۹۔محمد شاہ بادشاہ: 28 ربیع الآخر شب جمعہ 1161ھ کو رحلت کر گئے۔آزاد بلگرامی نے تاریخ وفات کہی۔

''گشت تاریخ چوں کشیدم آہ

موت شاہ و وزیر و آصف جاہ''

1161ھ

۱۰۔معز: وفات 1101ھ میں دکن میں ہوئی۔راقم نے تاریخ وفات کہی۔

موسوی خاں یگانۂ عالم رخت ہستی بہ سوئے عقبیٰ برد

سال فوتش زہاتف علی شدندا ''آں معز فطرت مردؔ

1101ھ

۱۱۔مہدی: 1174ھ میں شہید ہو گئے۔راقم نے تاریخ کہی۔

''محمد مہدی شہید شدؔ''

1174ھ

۱۲۔ناصرؔ: 17 محرم 1164ھ میں رحلت کر گئے۔آزاد بلگرامیؔ نے تذکرہ سروآزادؔ میں تاریخ وفات کا قطعہ درج کیا ہے۔

''نواب عدل گستری جناب رفت

فرصت نہ داد تیغ حوادث شنا رافت

در ہفدم ہم زماہ محرم شہید شد
تاریخ گفت نوحہ ''آفتاب رفت''
1164ھ

۱۳۔نجاتؔ: 10 شوال 1175ھ میں انتقال ہوا۔
میر اولاد محمد کامیابؔ نے تاریخ وفات کہی
قطعہ ''نجات یافت زدامِ زمانۂ صیادؔ''
اور راقم نے بھی تاریخ وفات کہی۔

''نجات یافتہ زیں بے وفا جہاں''
1175ھ

یقینؔ: 1169ھ میں انتقال ہوا۔ راقم نے تاریخ وفات کہی۔

''شاعر نازک سخن و خوش خیال | کرو سفر جانب ملکِ عدم
سال وفاتش خرد نکتہ سنج | گفت'' یقین رفت بسوئے ارم
1169ھ

عبدالقادر ساؔمی اورنگ آبادی اُس دور کے ایک اہم شاعر اور صاحب دیوان گذرے ہیں۔ ساؔمی کا ذکر سب سے پہلے چھمی نرائن شفیق نے تذکرہ چمنستان شعراء میں کیا ہے اور ساتھ ہی اُن کا کلام اور مثنوی سرو شمشاد کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''حق تعالیٰ سلامت دارد۔ ''قصّہ سرو شمشاد'' قریب وصفت ہزار بیت بزبان ریختہ موزون کردہ بود، دراحبّاش نسخۂ مذکور صاف نشدہ بدزدی رفت، مگر چند اجزا لے اول از جائے بدست افتاد، باز از سرنو در تصنیف تتمّہ سرگرم است، درنامہائے سوال و جواب سرو و شمشاد قیامت برپا کردۂ و پایۂ معنیٰ تلاش بہفتم فلک رسانده۔ درین نسخہ دل خواست، بقلم می آید و قصّہ طالب موھن'' کہ برغم ''قصہ لعل و گوہر'' عارف الدین خاں عاجز گفتہ است، بسیار ملاحت دارد۔ لیکن ''بہ سرو و

شمشاد‘‘ نمی رسد’’۔(۳۲)

شفیق نے تذکرہ چمنستان شعراء میں جہاں سامی کے حالاتِ زندگی کو قلمبند کیا ہے وہیں سامی کی مثنوی ’’سرو وشمشاد‘‘ اور مثنوی کا چوری ہونا اور پھر اس مثنوی کو از سرنو ترتیب دینا اور ’’سرور وشمشاد‘‘ کے قصہ کے جواب میں عارف الدین عاجز ’’قصہ لعل و گوہر‘‘ کا لکھنے ذکر کیا ہے اور وہی مثنوی کے اشعار اور سامی کے کلام کو بھی پیش کیا ہے۔شفیق کے بعد عبدالجبار خاں ملکاپوری نے اپنی تصنیف ’’محبوب الزمن تذکرہ شعرادکن‘‘ (جلد اول) میں سامی کے حالات زندگی کی تفصیل اور مثنوی ’’سرووشمشاد‘‘ اور صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا ہے۔مگر کوئی نمونہ کلام نہیں دیا ہے۔

’’آپ صاحب دیوان تھے اور آپ نے ایک قصّہ سروشمشاد کے بیان میں لکھا۔ اس کے اشعار چند ہزار تھے۔ اب وہ قصہ نادر الموجود ہے۔ پھر ازسرنو گیارہ سو پچہتر میں اُس کو تیار فرمایا۔ہم اُس میں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کریں گے۔ آپ صاحب التالیف والتصنیف تھے۔آپ نے ایک سروشمشاد قصّہ لکھا۔مثنوی کی طرز پر تھا۔کئی ہزار اس کے اشعار تھے۔ایک وقت سوء اتفاق سے قصّہ مغفور ہوگیا۔ آپ کو اُس کے تلف ہونے کا بہت رنج ہوا۔ پھر آپ نے 1175 ھ میں ازسرنو قصّہ کو تصنیف فرمایا......آپ کا دیوان وقصہ سرو شمشاد میرے کتب خانہ نوادر میں موجود تھا۔میرا کتب خانہ 1326 ھ ہجری میں موسیٰ ندی کی طغیانی میں غرق آب و نذر سیلاب ہوگیا۔ صاحب ترجمہ کا ’’دیوان قصّہ سروشمشاد بھی کتب خانہ کے ساتھ تہ آب وتلف ہوگئے‘‘۔(۳۳)

آگے سامی کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’غزل ہائے تمکین و کتب ہائے دلنشین، متخمسات و مستزاد و رباعیات وقطعات وقصائد لائق تحسین وآفرین کا کشکول ہے۔آپ

کے اکثر قصائد خدا و رسول ﷺ و اہل اللہ کے فضائل و مدائح میں ہیں''۔(۳۴)

جہاں عبدالجبار خاں ملکاپوری نے سامیؔ کی مثنوی سروشمشاد اور اُن کے کلام کا ذکر کیا ہے اور وہی رودِ موسیٰ کی طغیانی میں سامیؔ کی مثنوی سروشمشاد اور دیوان کا بہہ جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے سامیؔ کی مثنوی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''ادارے کے کتب خانہ میں سروشمشاد کا قصّہ محفوظ ہو گیا ہے۔ یہ اگرچہ ناقص الاول والآخر ہے۔ تاہم اس میں 3350 ابیات ہیں۔ اس مثنوی میں مصنف نے کوئی 505 علوم وفنون کی معلومات بھی اثنائے قصّہ میں درج کردی ہیں۔ اس طرح یہ مثنوی دکن کی اہم کتابوں میں سے ہے''۔(۳۵)

''پہلی بات تو یہ ہے کہ مثنوی کے درمیان پانچ سو پانچ علوم و فنون کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مخطوطہ کے ورق دوب، ہر مصرع میں یہی اعداد لکھے ہوئے ہیں۔ راقم الحروف نے جب مثنوی کے درمیان بیان کردہ علوم وفنون کا شمار کیا تو صرف زین کا تذکرہ ملا۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سامیؔ نے غالباً 55 فنون اعداد میں لکھا ہوگا۔ کاتب کے قلم نے دونوں پانچ کے درمیان ایک نقطہ بڑھا دیا اور اس طرح علوم وفنون کی تعداد 505 ہوگئی۔

یہ مثنوی کراؤن سائز کے 187 ورق پر محیط ہے جس میں سے آخر کے تین ورق کا نصف متن پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ ہر صفحہ پر 9 شعر ہیں اور جس صفحہ پر عنوان لکھا گیا ہے وہاں اشعار اور بھی کم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مخطوطہ میں صرف 2850 اشعار ملتے ہیں''۔(۳۶)

حوالے

1- ''تین تذکرے'' نثار احمد فاروقی 1968ء ص309

2- لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے۔ سید محمد رضا ساجد رضوی 1990ء۔ص48

3- ''تذکرہ چمنستان شعراء'' لچھمی نرائن شفیق۔ مرتب مولوی عبدالحق 1928ء۔ص494

4- ''مثنوی تصویر جاناں'' لچھمی نرائن شفیق۔ مرتب خواجہ حمیدالدین شاہد 1957ء۔ص2

5- ''تذکرہ چمنستان شعراء'' لچھمی نرائن شفیق۔ تلخیص وترجمہ سید شاہ عطاالرحمٰن عکا کاکوی 1968ء ص74

6- ''لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے'' سید محمد رضا ساجد رضوی، 1990ء ص

7- ''تذکرہ چمنستان شعراء'' لچھمی نرائن شفیق۔ تلخیص وترجمہ سید شاہ عطاالرحمٰن عطا کاکوی 1968ء ص48

8- ''تذکرہ چمنستان شعراء'' لچھمی نرائن شفیق۔ مرتب مولوی عبدالحق۔1928ء ص4

9- لچھمی نارائن شفیق اورنگ آباد حیات اور کارنامے'' سید محمد رضا ساجد رضوی، 1990ء ص58

10- ایضاً ص60

11- ''محبوب الزمن تذکرہ شعراء دکن جلد اول''۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری 1910ء ص580

12- ''تذکرہ'' شام غریباں'' لچھمی نرائن شفیق مرتب محمد اکبرالدین صدیقی 1977ء ص8

13- ''تین تذکرے'' نثار احمد فاروقی 1965ء ص41

14- ایضاً ص316

15- ''لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے'' سید محمد رضا ساجد رضوی 1990ء ص81

16- ''شفیق اورنگ آبادی کی ایک نایاب مثنوی'' از۔ افسر صدیقی۔ قومی زبان کراچی۔ اگست 1968ء ص47

17- ''تلاش سیر''۔ نثار احمد فاروقی 1994ء ص164

18- ''تذکرہ چمنستان شعراء'' لچھمی نرائن شفیق۔ مرتب مولوی عبدالحق 1928ء ص3-2

19- ایضاً ص17-16

20- ''کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات (جلد اول)۔نصیرالدین ہاشمی 1961ء ص264

21- تذکرہ ''چمنستان شعراء'' لچھمی نرائن شفیق۔مرتب مولوی عبدالحق 1928ء ص16

22- ''دکن میں اردو''نصیرالدین ہاشمی 2002ء ص403

23- ''تذکرہ گل عجائب'' اسد علی خاں تمنّا۔مرتب مولوی عبدالحق 1932ء۔ص4

24- ''کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات'' (جلد اول)۔نصیرالدین ہاشمی 1961۔ص30

25- ''دکن میں اُردو''نصیرالدین ہاشمی 2002ء،ص405

26- تذکرہ ''چمنستان شعراء'' لچھمی نرائن شفیق۔مرتب مولوی عبدالحق 1928ء ص119

27- ایضاً ص118

28- ایضاً ص109

29- ایضاً ص124

30- ایضاً ص124

31- ایضاً ص151

32- ''چمنستان شعراء'' لچھمی نرائن شفیق،مرتب مولوی عبدالحق 1928ء۔ص412

33- ''محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن'' (جلد اول) عبدالجبار خاں ملکاپوری 1991ء ص10-508

34- ایضاً ص509

35- تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو (جلد اول)۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔1984ء ص72

36- ''عبدالقادر سامی اورنگ آبادی کی غزل گوئی......ایک بازیافت''۔از۔حبیب نثار۔رسالہ سب رس،فروری 2015ء ص27

باب چہارم

مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی کی نثری تصانیف

(الف) معراج العاشقین

معراج العاشقین

معراج العاشقین دکنی کا ایک نثری رسالہ ہے جس کا موضوع تصوف ہے۔اس رسالے میں بیجاپوری تصوف پانچ عناصر پچیس گن کو پیش کیا گیا ہے۔اس رسالے کو مولوی عبدالحق نے پہلی مرتبہ 1924ء میں مرتب کیا اور اورنگ آباد سے شائع کیا۔مولوی عبدالحق نے معراج العاشقین کو دو نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا ہے۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''اس اثناء میں مولوی غلام محمد صاحب انصاری وفا مدیر ''تاج'' نے ایک رسالے ''معراج العاشقین'' کا پتہ ڈاکٹر محمد قاسم صاحب کے کتب خانے سے لگایا اور جب انھوں نے مجھے یہ نسخہ دکھایا تو چند سطریں پڑھنے کے بعد ہی مجھے یہ خیال آیا کہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے۔نکال کے دیکھا تو ایک ہی کتاب کی دو نقلیں تھیں۔البتہ کہیں کہیں الفاظ اور عبارت کا اختلاف تھا جو قلمی نسخوں میں اکثر پایا جاتا ہے۔مگر ڈاکٹر صاحب کے نسخے میں ایک بات کام کی نظر آئی کہ اس کے آخر میں یہ تحریر ہے کہ ایک قدیم نسخے سے جس کا سنہ کتابت 906ھ تھا''۔(۱)

تدوین متن کا سب سے اہم مرحلہ، مصنف کا نام، سنہ کتابت اور مخطوطے کی کیفیت ہوتی ہے۔ایک محقق کو یہ ان باتوں کی معلومات نہ ہو تو تحقیق کا راستہ ہی بند ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی محقق کو اندھیرے میں تیر چلانا پڑتا ہے۔نویں صدی ہجری سے لے کر بارہویں صدی ہجری تک کئی ایسے رسالے لکھے گئے جس کا موضوع تصوف تھا۔ہر طرف تصوف کا بول بالا ہو رہا تھا اور کئی ایسے مرید تھے جنھوں نے اپنے کئی تصانیف کو اپنے پیر و مرشد کے نام معنون کر دیئے جس کی وجہ تحقیق میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔مولوی عبدالحق نے 1924ء میں پہلی مرتبہ معراج العاشقین کو شائع کیا تو انھیں بھی اس بات کا شک ضرور تھا کہ جو رسالہ اِن کے پاس موجود ہے کہیں وہ حضرت خواجہ بندہ نواز کا ہے یا نہیں۔اس شک کو مدنظر رکھتے ہوئے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''مجھے ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ جو رسالے میرے پاس موجود ہیں وہ
حقیقت میں حضرت بندہ نواز کی تصنیف ہیں یا نہیں کیوں کہ بعض
رسالے جن کی نسبت متعدد ذرائع اور تواتر روایتوں سے یہ معلوم ہوا تھا
کہ حضرت نے دکھنی میں لکھے تھے۔ تحقیق کرنے سے ثابت ہوا کہ اصل
فارسی میں موجود ہیں اور یہ ان کا ترجمہ ہے''۔(۲)

معراج العاشقین کو پہلی مرتبہ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا اور یہ ثابت کیا کہ یہ رسالہ حضرت خواجہ بندہ نواز کا ہے اور یہ رسالہ دسویں صدی ہجری کا ہے۔ مگر 1967ء میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی تصنیف ''معراج العاشقین'' کا مصنف کی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ یہ رسالہ نویں صدی ہجری کا نہیں۔ بلکہ گیارہویں صدی ہجری کے اواخر کی تصنیف ہے اور اس کے مصنف میراں جی خدانما کے مرید و خلیفہ سید مخدوم شاہ حسینی بلکانوری oyzاور اس تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ برہان الدین کی تصنیف ''کلمۃ الحقائق'' اُردو کی پہلی نثری تصنیف ہے جس پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں:

اُردو نثر کی تاریخ میں برہان الدین جانم کی اہمیت اُن کی اولیت
ہے۔ اُن سے پہلے کی کوئی نثری تصنیف ہم تک نہیں پہنچی۔ اب یہ بات
بھی پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ''معراج العاشقین'' خواجہ بندہ نواز
گیسودراز کی تصنیف نہیں ہے بلکہ گیارہویں صدی ہجری کے اواخر یا
بارہویں صدی ہجری کے اوائل کی تصنیف ہے اور اس کے مصنف
مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری ہیں۔(۳)

اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اُردو کی پہلی نثری تصنیف ''کلمۃ الحقائق'' ہے۔ مگر مولوی عبدالحق کی تحقیق کو بنیاد بنا کر دکنی کے کئی محققین نے معراج العاشقین کو دوبارہ شائع کیا۔ مولوی عبدالحق کے بعد گوپی چند نارنگ نے جولائی 1957ء میں شائع کیا۔ گوپی چند نارنگ معراج العاشقین کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''رسالہ معراج العاشقین کو اُردو کی ابتدائی نثری تصانیف میں

جو اہمیت حاصل ہے...... بیان نہیں۔ آج سے تیس سال قبل ڈاکٹر مولوی
عبدالحق نے اُسے شائع فرمایا تھا۔ اس ...... ان میں یہ رسالہ مختلف
یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہوگیا اور اس کی مانگ بڑھتی رہی۔
اِدھر ایک مدت سے یہ نایاب ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر اسے پھر
شائع کیا جارہا ہے''۔(۴)

رسالہ معراج العاشقین کو گوپی چند نارنگ نے مولوی عبدالحق کے پورے 30 سال بعد شائع کیا۔ گوپی چند نارنگ اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ مقدمے میں حضرت خواجہ بندہ نواز کی سوانح حیات، معراج العاشقین کے موضوع پر تبصرہ، لسانی خصوصیات، فرہنگ اور آخر میں عربی عبارتوں کا ترجمہ بھی دیا ہے۔ مگر انھیں کہیں بھی اس بات پر شک نہیں ہوا کہ اس رسالے میں جو تصوف بیان کیا گیا ہے، اس کا تعلق حضرت خواجہ بندہ نواز کے عہد سے نہیں ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے 20 مئی 1957ء کو شائع کیا۔ دیباچے میں اپنے شائع کرنے کی وجہ پر روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

''تقریباً تیس سال پہلے ڈاکٹر عبدالحق نے اسے شائع کیا تھا۔
مگر اب یہ بالکل نایاب ہے۔ میں نے معراج العاشقین کے ساتھ
حضرت بندہ نواز کا دکنی کلام بھی اس کتاب میں شامل کردیا ہے تاکہ
لسانی مطالعہ کرنے والوں کے لئے آسانی ہو سکے''۔(۵)

مولوی عبدالحق اور گوپی چند نارنگ کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے معراج العاشقین کو اپنے طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ خلیق انجم نے مقدمے میں کوئی نئی بات نہیں پیش کی۔ مگر ڈاکٹر جمیل جالبی نے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق کو بنیاد بنا کر اپنی تصنیف تاریخ ادب اُردو جلد اوّل میں لکھتے ہیں:

''معراج العاشقین'' بھی جواب تک اُردو کی پہلی نثری تصنیف
مانی جاتی رہی ہے، اُس دور کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اُس کے مصنف
خواجہ گیسودراز کے بجائے مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری ہیں جنھوں نے
گیارہویں صدی ہجری کے نصف آخر یا بارہویں صدی کے اوائل میں

تلاوۃ الوجود کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا‘‘۔(۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ اُردو جلد اوّل 1977ء میں منظر عام پر آئی۔ مگر ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تصنیف ’’معراج العاشقین کا مصنف‘‘ 1967ء میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے ثابت کیا کہ معراج العاشقین حضرت خواجہ بندہ نواز کی نہیں بلکہ چشتیہ سلسلے کے ایک صوفی بزرگ مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کی ہے۔ لیکن معراج العاشقین پر سب سے حیرت انگیز تحقیق ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی ملتی ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی تصنیف اُردو نثر کا آغاز وارتقاء جو 1978ء میں شائع ہوئی۔ یہ تصنیف ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تصنیف کے پورے دس سال بعد شائع ہوئی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے معراج العاشقین کو خواجہ بندہ نواز کے رسالوں کے ساتھ معراج العاشقین کا ذکر کیا ہے، لکھتی ہیں:

ان رسالوں میں جواب تک شائع ہو چکے ہیں سب سے پہلا رسالہ ’’معراج العاشقین‘‘ ہے جسے مولوی عبدالحق نے اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ مرتب فرمایا تھا۔ یہ رسالہ تاج پریس حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا تھا......اس رسالے کی تصنیف کا سنہ متعین طور پر معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب کا خیال یہ ہے کہ سب 901ھ یا اس کے لگ بھگ کی تصنیف ہے‘‘۔(۷)

معراج العاشقین کا مطالعہ کرتے وقت کئی سوالات اُبھرتے ہیں۔ کیا معراج العاشقین حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہے؟ کیا معراج العاشقین دسویں صدی ہجری کی تصنیف ہے؟ کیا معراج العاشقین میں جو تصوف (پانچ عناصر پچیس گن) کو پیش کیا گیا ہے۔ کیا وہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ دراصل معراج العاشقین کی حقیقت ہے کیا؟ معراج العاشقین کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے مولوی عبدالحق کے حوالے سے ڈاکٹر حفیظ قتیل لکھتے ہیں:

’’مولوی عبدالحق کے شائع کردہ رسالے معراج العاشقین میں پانچ عناصر اور ان گنوں کا جو تصوف پیش کیا گیا ہے وہ عام تصوف سے مختلف ہے۔ دکھنی مخطوطات کے ذخائر میں نظم ونثر کے بکثرت رسائل

سے ملتے ہیں جن میں اس مخصوص تصوف کو بیان کیا گیا ہے۔ اُن رسالوں میں نہ صرف مسائل کی ترتیب میں یکسانیت ہے بلکہ اصطلاحات، الفاظ اور اسالیب کی تھکا دینے والی یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض رسائل تو ایسے بھی ملتے ہیں جن کی تالیف مختلف مصنفین کے رسائل کے اقتباسات کو جوڑ کر کی گئی ہے اور چونکہ ان سب رسائل میں وہی بیجاپور کا مخصوص تصوف بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے اپنے رسالوں کی ترتیب و تسلسل میں بھی فرق نہیں آتا۔ اسی وجہ سے جن رسائل پر مصنف کا نام اور سنہ تصنیف درج نہیں ہوتا اور دکھنی کے ذخائر میں ایسے رسالے بکثرت ہیں۔ محقق کے لئے ان کے زمانے اور مصنف کا تعین پریشان کن ثابت ہوتا ہے''۔(۸)

معراج العاشقین کی حقیقت دراصل یہ ہے کہ معراج العاشقین نویں صدی ہجری کی نہیں بلکہ گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں صدی کے اوائل کی تصنیف ہے اور معراج العاشقین میں جو تصوف پیش کیا گیا ہے وہ بیجاپوری تصوف سے تعلق رکھتا ہے۔ برہان الدین جانم اپنے رسالوں میں چار عناصر آگ، پانی، ہوا، مٹی کو پیش کئے۔ مگر امین الدین علی اعلیٰ نے چار عناصر کے بجائے پانچ عناصر، آگ، پانی، مٹی اور خالی (آکاش) کو پیش کئے۔ یہ روایت اتنی عام ہوگئی کہ امین الدین اعلیٰ کے سلسلے کے کئی بزرگوں نے اس روش کو آگے بڑھایا۔ اِن بزرگوں میں ایک اہم نام سید مخدوم شاہ حسینی بلکانوری ہیں جنھوں نے اس روایت کو اپنے رسالہ تلاوت الوجود میں بیان کئے۔ تلاوت الوجود فارسی رسالہ ہے اور یہ رسالہ مرید اور مرشد کے سوال و جواب کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ اس رسالے کے کئی نسخے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے انہی تلاوت الوجود کے رسالوں کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کی درجہ بندی کی ہے، لکھتے ہیں:

''بیجاپوری تصوف کے اسی قلمی سرمائے میں مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کے تین رسالے شامل ہیں جن میں سے ایک رسالے کے نسخے کم اور تین رسالوں کے نسخے بکثرت ملتے ہیں۔ سہولت کے لئے ان

رسالوں کوا۔ب۔ج قرار دیا جاتا ہے‘‘۔(۹)

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی تصنیف ’’معراج العاشقین کا مصنف‘‘ میں رسالہ ’الف‘ کی پوری تفصیل پیش کی ہے اور ساتھ ہی رسالہ ’الف‘ کے پینتیس (35) ابواب کے نام بھی دیئے ہیں تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ رسالہ ’الف‘ اور ’ب‘ میں کیا فرق ہے اور آگے رسالہ ’ب‘ کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں۔

’’رسالہ ’ب‘ نسبتاً مختصر ہے جس کے نسخے سائز کی کمی بیشی یا خط کے جلی یا خفی ہونے کے باعث 100 سو تا ایک سوتیں صفحات تک محیط ملتے ہیں۔اس رسالے کے نسخے حسبِ ذیل دس ناموں سے پائے جاتے ہیں۔

ا۔تلاوۃ الوجود حقیقت المعراج ومعرفت المحبوب۔

۲۔تلاوۃ الوجود حقیقت المعراج۔

۳۔تلاوۃ الوجود۔ ۴۔تلاوۃ الوجود وگنج العرش

۵۔حقیقت المعراج۔۶۔تلاوۃ المعراج

۷۔معراج نامہ۔۸۔وجود المعراج

۹۔معراج العاشقین۔ ۱۰۔وجود المعراج العاشقین (۱۰)

’’رسالہ (ج) ایک نہایت مختصر رسالہ ہے جو بیس ۲۰ تا پچیس ۲۵ صفحات پر مشتمل ملتا ہے۔اس رسالہ کے ہر نسخہ میں آغاز الا الہ الخلق والامر سے ہوتا ہے۔اس رسالے کے تین نام ہیں۔

ا۔تلاوۃ الوجود۔۲۔تلاوۃ الوجود مراۃ السالکین۔۳۔سوال نامہ(۱۷)

یہ سچ ہے کہ برہان الدین جانم اور امین الدین علی اعلیٰ نے بیجاپور میں جس تصوف کی ابتداء کی وہ تصوف اس قدر عام ہوگیا کہ ہر کوئی اسی تصوف کو بنیاد بنا کر کئی رسالے لکھے۔ان رسالوں میں مخدوم شاہ حسینی بلکا نوری کا رسالہ تلاوۃ الوجود اور اُس کے کئی نسخے سامنے آئے۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معراج العاشقین،تلاوۃ الوجود

کے کس نسخے سے تعلق رکھتا ہے۔ڈاکٹر حفیظ قتیل نے تلاوۃ الوجود کے نسخے کی اِس اُلجھن کو'ا' ،'ب' ،'ج' نام دے کراوران رسالوں کا ایک دوسرے سے تقابل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ مرتبہ معراج العاشقین کا تعلق کس نسخے سے ہےاورآخرمیں نتائج بھی دیئے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

''رسالۂ معراج العاشقین مولوی عبدالحق کا تعلق رسالہ (الف) سے نہیں بلکہ رسالہ (ب) سے ہے۔(ا) رسالہ (ب) کا آغاز رسالہ (الف) کے تیئسویں باب سے ہوتا ہےاوراپنے نو ابواب میں رسالہ (الف) کے آخری بارہ ابواب کو سمیٹ لیتا ہے۔اس کے بعد پانچ ابواب رسالہ الف کے ابتدائی ابواب میں سے لئے گئے ہیں۔اگرچہ معراج العاشقین میں ابواب کی سرخیاں نہیں ہیں لیکن مباحث کی ترتیب وہی ہے جو رسالہ (ب) کی ہے۔

(2) معراج العاشقین میں بعض عبارتیں ایسی ہیں جو رسالہ (ب) میں ہیں رسالہ (الف) میں نہیں جیسے:-(رسالہ ب) قال علیہ السلام لا واحۃ للمومنین دون لقاءاللہ۔اس کا معنیٰ نبی علیہ السلام کے نہیں ہے اور راحت مومن کوں اللہ کو دیکھے بغیر یوں حضرت کے بولنے پر ایمان نالیایا تو اسلام تے دوڑ پڑتا ہے۔

(معراج العاشقین) قال علیہ السلام لا راحۃ للمومنین الا بلقاء اللہ دیکھے بغیر یوں حضرت کے بولنے پر ایمان نالایا تو اسلام نے دور پڑتا ہے۔

(3) (رسالہ الف) دیکھتا دستا دوسیری جان پنے کے سنگ۔ جان بن کا آئینہ دور کر بوج لے واحد رنگ۔

(رسالہ ب) دیکھتا دستا دو دسیری جان پنے کے سن کر (سنگ)۔ جاپنپنے کی آرسی دور کر بوچ لے واحد رنگ (معراج

العاشقین)اے جان نبی کے سبب جان نبی کے آرسی دور کر یوج واحد رنگ۔

قطع نظراس کے کہ معراج العاشقین میں شعر کی کیا درگت بنی ہے۔نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ رسالہ (الف) میں آئینہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔رسالہ(ب) میں اس کی جگہ آرسی کا لفظ ہے تو معراج العاشقین میں بھی آرسی کا لفظ ہے۔

(4) معراج العاشقین کی پوری عبارت رسالہ(ب) میں ہے۔ رسالہ(الف) میں نہیں ہے۔

معراج العاشقین کا تعلق رسالہ (الف) سے نہیں بلکہ رسالہ (ب) سے ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ معراج العاشقین کی پوری عبارت رسالہ(ب) میں ہے تو اس سے دو ہی نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

(ا) مطبوعہ معراج العاشقین تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے۔

(ب) معراج العاشقین بنیادی رسالہ ہےاور تلاوۃ الوجود اس کی شرح ہے۔(۱۲)

اب اس میں کوئی شک نہیں کہ مرتبہ معراج العاشقین کا تعلق تلاوۃ الوجود کے نسخہ الف سے نہیں بلکہ نسخہ (ب) سے ہے۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسالہ معراج العاشقین دراصل کیا ہے۔کیا معراج العاشقین تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے یا پھر تشریح۔معراج العاشقین دراصل تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے۔کیوں کہ مخدوم شاہ حسینی بلکانوری نے پہلے رسالہ الف لکھا۔رسالہ'الف' 192 صفحات اور پینتیس 35 ابواب پر مشتمل ہے۔اس کے بعد رسالہ'ب' لکھا۔یہ مختصر رسالہ ہے جو 100 صفحات پر محیط ہے۔رسالہ'الف' کا تینتیسویں 33 باب (باب سی دسوم درصفت معراج محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) سے علیحدہ کر کے رسالہ(ب) لکھا اور اِسی رسالے میں پانچ عناصر پچیس گن کے تصوف کو بیان بھی کئے ہیں۔لیکن معراج العاشقین اور رسالہ تلاوۃ الوجود کا تقابلی

مطالعہ کیا جائے تو کوئی بھی یہ رائے نہیں قائم کرسکتا۔ معراج العاشقین رسالہ تلاوۃ الوجود کی شرح ہے یا خلاصہ۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی تصنیف میں رسالہ (ب) اور معراج العاشقین کا تقابل کر کے اپنی رائے دی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''تلاوۃ الوجود اور معراج العاشقین کی ان عبارتوں کے مطالعہ سے یہی نتیجہ مستخرج ہوتا ہے کہ معراج العاشقین تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے۔ نہ کہ تلاوۃ الوجود معراج العاشقین کی شرح ہے اور یہ خلاصہ تلخیص کے تیسرے طریقے سے قریب ہے۔ اس لئے کہ معراج العاشقین میں کہیں کہیں دو چار الفاظ یا ایک دو فقروں کا اضافہ بھی ہے''۔ (۱۳)

مولوی عبدالحق نے معراج العاشقین کو حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف قرار دیا مگر جب ڈاکٹر حفیظ قتیل نے 1967ء میں یہ ثابت کیا کہ معراج العاشقین کو حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کی ہے۔ مخدوم شاہ حسینی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کئی تذکرے خاموش ہیں لیکن ان کی تصنیف تلاوۃ الوجود کے اندرونی شہادت سے کچھ معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل تلاوۃ الوجود کا حوالہ دیتے ہوئے اُن کے نام اور وطن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''رسالہ (الف) میں خود مصنف نے اپنے نام اور وطن کی وضاحت کی ہے۔ از تصنیف فقیر حقیر مخدوم شاہ حسینی رہنما خانوادۂ چشت اہل بہشت وطن در دکن دارالظفر بیجاپور جانشین محل رائے چور پرگنہ کونال ساکن قصبۂ بلکانور''۔ (۱۴)

تلاوۃ الوجود فارسی کی تصنیف ہے اور اُس کے کئی نسخے موجود ہیں۔ انھیں نسخوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مخدوم شاہ حسینی، پیر اللہ حسینی جو میراں جی خدانما کے فرزند مرید اور خلیفہ گذرے ہیں۔ میراں جی خدانما کے خلفاء کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات نہیں اُن کے صرف پانچ خلفاء کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں اُن کے صاحبزادے سید امین الدین علی اعلیٰ ثانی، میراں یعقوب، خلیفہ شاہ عبدالحلیم، سید سہراب الدین رضوی اور پیر اللہ حسینی شامل ہیں۔

تلاوۃ الوجود کے ایک نسخے میں پیراللہ حسینی کا نام بیراللہ حسینی لکھا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی تصنیف ''میراں جی خدانما'' میں اس کی تفصیل دی ہے اور ساتھ ہی میراں جی خدانما کا سلسلہ بیعت وخلافت کا شجرہ بھی دیا ہے۔ شجرہ ملاحظہ ہو۔

میراں جی خدانما کا سلسلہ بیعت وخلافت

سیدامین الدین علی ثانی فرزندوخلیفہ شاہ میراں جی دھول پیٹھ	سہراب الدین	میر ایعقوب	شاہ پیراللہ حسینی	شاہ عبدالحلیم چشتی
	بڑے شاہ حسینی ہمشیرزادہ وجانشین سیدعلی حسینی فرزند وجانشین		سید مخدوم شاہ حسینی مصنف گنج مخفی	سیدسہراب الدین رضوی میر ابوصالح سرمست حسینی چشتی
	حمیداللہ حسینی ہمشیرزادہ و جانشین سید جمال اللہ حسینی فرزند و جانشین			سیدمحمد الثانی گنج بخش
	زین علی روز بہانی	قطب المدار شیخ محمد چشتی فصل علی صاحب چشتی		سیدعبدالجلیل سجادہ نشین روضہ (ص15)

دراصل مخدوم شاہ حسینی کے پیرومرشد کا نام پیراللہ حسینی ہی ہے۔ اس کی دوسری مثال مخدوم شاہ حسینی کی نظم ''میزوانی نامہ'' سے ہوتی ہے جس کا تعارف ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس نے اپنے مقالہ ''اٹھارویں صدی کی دکنی شاعری کی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' میں کیا ہے۔ یہ نظم تمثیل کے انداز میں لکھی گئی ہے اور اس میں بیجاپوری تصوف پانچ عناصر اور پچیس گن کے علاوہ شادی، بیاہ کے رسومات کو استعاروں کے ساتھ نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے ہیں اور آخر میں مخدوم شاہ حسینی نے اپنے نام اور تخلص کے ساتھ اپنے پیرومرشد کا نام بھی نظم کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو......

حسینی پیر اللہ مجھے ہیں پیر اللہ
عاشق ہوکر مخدوم دیکھے جیو اُجالا (۶۱)

مخدوم شاہ حسینی کے پیرومرشد کا نام پیراللہ حسینی ہی ہے اور پیراللہ حسینی کو میراں جی خدانما سے بیعت بعض

دوسرے شجروں سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ پیر اللہ حسینی دراصل کاتبوں کی غلطی ہوسکتی ہے۔ کیوں کہ بعض مخطوطات میں پ، چ، ژ، ش کے تین نقطے کے بجائے صرف ایک نقطہ دیا جاتا تھا۔ اسی طرح پیر اللہ حسینی کو کاتبوں نے ببر اللہ حسینی بنادیا ہے۔

اِس طرح مخدوم شاہ حسینی کا نام، وطن، پیر و مرشد کا نام اور ایک فرزند (پیر اللہ ص ۸۱) کے علاوہ اُن کی چند تصانیف سامنے آئی ہیں۔

مخدوم شاہ حسینی ایک کثیر التصانیف بزرگ گزرے ہیں۔ اُن کا تصنیفی سرمایہ نظم اور نثر دونوں میں موجود ہے۔ اُن کے نثری تصانیف میں سوال نامہ، تلاوۃ الوجود، معراج العاشقین ہیں اور کچھ قدیم بیاضوں میں اُن کی نظمیں ملتی ہیں۔ جن میں میزوانی نامہ، منڈوا نامہ، زراعت نامہ، مثنوی عقد فاطمہ، معجزات رسالت، نافرمان عورت، قصہ مرد و عورت، شادی نامہ رسول خدا اور جنگ نامہ نفس و روح ہیں۔ مگر ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے مثنوی عقد فاطمہ، معجزات رسالت، نافرمان عورت، قصہ مرد و عورت، شادی نامہ رسول خدا اور جنگ نامہ نفس و روح پر شک ظاہر کیا ہے۔

معراج العاشقین کا موضوع تصوف ہے اور اس میں پانچ عناصر پچیس گن کے فلسفہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس فلسفہ کے ابتدائی نقوش میراں جی شمس العشاق کے رسالوں میں نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے چشتیہ سلسلے کے کسی صوفی کے پاس یہ فلسفہ نہیں ملتا۔ میراں جی شمس العشاق حضرت کمال الدین بیابانی کے مرید اور خلیفہ گزرے ہیں۔

میراں جی شمس العشاق کی تاریخِ پیدائش میں بہت اختلاف ملتا ہے۔ مگر ڈاکٹر حبیب نثار نے میراں جی شمس العشاق کی تاریخ پیدائش کو موضوع بنا کر ایک تحقیقی مضمون لکھا ہے جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں بعد تحقیق کے جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے:

> ''میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ برہان الدین جانم کے لکھے ہوئے مرثیے کو بنیاد بنا کر انھوں نے میراں جی شمس العشاق کی تاریخ پیدائش 922ھ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ بیجاپور پر لکھی گئی فارسی تصنیف ''   ''میں لکھا ہوا ہے کہ

میراں جی شمس العشاق علی عادل شاہ اول کے شاہ پور بسانے کے دوسرے برس دکن تشریف لائے۔علی عادل شاہ اوّل نے 965ھ میں اپنی تخت نشینی کی یادگار کے طور پر اپنے دارالسلطنت بیجاپور سے دس کوس دور شاہ پور بسایا تھا۔میراں جی شمس العشاق کے نسب نامے میں اُن کی زندگی کے واقعات ملتے ہیں جس میں لکھا ہوا ہے کہ آپ نے 22 برس کی عمر میں بیت اللہ شریف کا سفر اختیار کیا اور وہاں سے مدینہ منورہ پہنچے۔ جہاں آپ نے بارہ برس تک آپ ایک ہی پہلو پر شب گذارا کرتے تھے۔ ڈاکٹر حبیب نثار نے لکھا ہے کہ 12+22+922ھ 956ھ ہوتے ہیں۔اگر ہم بیجاپور کی تاریخ کے سنہ کو صحیح تسلیم کریں تو یہاں دس سال کا فرق آتا ہے۔نسب نامہ میراں جی آپ کے وصال کے 200 برس بعد لکھا گیا ہے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ میراں جی کی عمر لکھتے ہوئے تسامح ہوا ہو اور مکہ معظّمہ روانگی کے وقت حضرت کی عمر 22 برس نہیں بلکہ 32 برس ہوسکتی ہے۔اس طرح برہان الدین جانم کے بیان کردہ تاریخ پیدائش 922ھ کے وسیلے سے جب ہم اس عرصہ کو شمار کرتے ہیں تو 966ھ برآمد ہوتا ہے یعنی 12+32+922 (=966)۔966ھ سنہ برآمد ہوتا ہے۔(۱۷)

پروفیسر گیان چند جین نے پروفیسر سیدہ جعفر کے تعاون سے لکھی گئی اپنی کتاب میں حضرت میراں جی شمس العشاق کے سنہ وفات کا تعین کر دیا ہے۔استادِ اساتذہ نے برہان الدین جانم کے متذکرہ بالا مرثیے ہی کے حوالے سے حضرت کا سنہ وفات 992ھ متعین کیا ہے۔جس سے اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔(۱۸)

مولوی عبدالحق نے بیجاپور کے صوفی شعراء کا جو مخطوطہ دیکھا تھا، اس میں شمس العشاق کی ترجمے پر ذوقی نے شمس العشاق کو آپ کی پیدائش کا تاریخی مادہ سمجھ لیا اور 902ھ آپ کی تاریخ وفات قرار دی۔مولوی عبدالحق کی اس باریافت پر تعجب ہوتا ہے۔اس لئے کہ متعدد تاریخی کتابوں، صوفیاء کے تذکروں میں میراں جی سے

پہلے اور میراں جی کے بعد صوفیاء کا لقب ''شمس العشاق'' ملتا ہے(کیا یہ تمام 902ھ میں پیدا ہوئے)۔ علاوہ ازیں ذوقی میراں جی کے عہد کے دوسو برس بعد ہوئے ہیں۔ راقمۃ الحروف نے عبدالحق کی اس بیان کردہ بیاض کی نقل استاد محترم حبیب نثار صاحب کے پاس دیکھی ہے۔ حضرت میراں جی کے ترجمے پر ذوقی کی یہ تحریر مخطوطے کے کاتب کی تحریر سے یکسر الگ ہے اور بہت ہی واضح انداز میں پہچانی جاسکتی ہے۔ مکمل تحریر یہ ہے:

''غلام حسین ذوقی ایں تاریخ گفت

شمس العشاق 902ھ

ماہ شوال تاریخِ بیت و پنجم روز پنجشنبہ''۔(۱۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذوقی دکنی کے ایک بڑے شاعر، ذوقِ فہم و سخن سنج تھے۔ لیکن اس مخطوطے پر جو تحریر موجود ہے اُس سے کہیں یہ واضح نہیں ہوتا کہ 902ھ حضرت میراں ج ی شمس العشاق کی تاریخ پیدائش ہے۔ مولوی عبدالحق نے جب از خود ذوقی کے حوالے سے ایسے 902ھ میراں جی شمس العشاق کی تاریخِ وفات قرار دی تب سے ایں دم تک اُردو کے محققین اور صوفیاء کرام 902ھ ہی کو حضرت میراں جی شمس العشاق کا سنہ وفات تسلیم کر رہے ہیں۔

اس بحث کی دوسری کڑی برہان الدین جانم ہیں۔ برہان الدین جانم میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ آپ 970ھ کے قریب شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں والد سے بیعت فرمائی اور حصول علم کے لئے تین برس سفر میں مشغول رہے۔ بیس برس کی عمر میں میراں جی شمس العشاق سے خلافت ملی۔ والد کے وصال کے بعد جانشین ہوئے اور درس و ہدایت دینے لگے۔(۲۰)

برہان الدین جانم چشتیہ سلسلے کے اُن بزرگوں میں سے ہیں جن کی تصانیف نے عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ جن میں کلمۃ الحقائق، ارشاد نامہ، بشارت الذکر، ہجت البقر، وصیت الہادی، رموز الواصلین، منفعت الایمان، نکتہ واحد اور سکھ سہلا ہیں اور انھیں تصانیف میں برہان الدین جانم نے اپنے والد کی روایت کو آگے بڑھایا جس کی تصوف کی ابتداء میراں جی شمس العشاق نے کی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی برہان الدین جانم کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جانم کی دو خدمات قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے

> تصوف کے فلسفہ وجود کو مرتب کر کے اُسے ایک باقاعدہ شکل دی اور آب وآتش، خاک و باد کے تعلق سے وجود کا مطالعہ کر کے اس کے چار مدارج واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود اور عارف الوجود مقرر کئے۔ دوسری یہ کہ تصوف و اخلاق اور شعریعت وطریقت کو اپنی تصانیف نظم ونثر کے ذریعے پیش کئے۔(۲۱)

برہان الدین جانم نے جس فلسفہ کو اپنے تصانیف میں پیش کئے ہیں دراصل ہندوستانی فلسفہ ہے اور ان کی تصانیف میں ہندوعقائد اور روحانیت کی اصطلاحات کا گہرا رنگ بھی ملتا ہے۔ وہ اِس فلسفہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ برہان الدین جانم نے اپنے فلسفہ میں چار عناصر آب، آتش، باد اور خاک کا ذکر کیا ہے۔ وہ آکاش کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ جبکہ ہندو فلسفہ میں آکاش کو بھی ایک عنصر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ہندو فلسفہ کی تفصیل پر بحث کرتے ہوئے حسینی شاہد لکھتے ہیں:

> ''ہندو فلسفے کے مطابق موجودات عالم کا ظہور پانچ تتوؤں سے ہوا ہے۔ پانچ تتوؤں کو وہ پنچ بھوت بھی کہتے ہیں۔ یہ کائنات انھیں سے پیدا ہوئی ہے اور انھیں میں غائب ہوجائے گی۔ اس لئے یہ پانچ تتو ''انادی'' ہیں۔ پنچ تتو یا پنچ بھوت کی پیدائش کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اول صرف ''برہما'' تھا جو سوم پرکاش ہے۔ اس کی صفت یعنی گن 'ہے' ہے۔ بعد اس کے مایا جو فرضی قرار دی گئی ہے اس سے گیان اور ''اگیان''، یعنی علم اور جہل پیدا ہوئے۔ علم سے مراد روشنی اور جہل سے مراد تاریکی ہے۔
>
> پس اول برہما تھا، اس کے بعد گیان اور اس کے بعد اگیان پیدا ہوا۔ اگیان سے اکاش (خالی) کا جنم ہوا۔ اس کی دو صفتیں مانی گئی ہیں۔ پہلی صفت برہما کی اور دوسری اس کی اپنی صفت یعنی ''شبد' اس کی اپنی ذاتی صفت سے ہوا پیدا ہوئی۔ جس کو ''وایو تتو'' کہتے ہیں۔ اس

میں تین گن ہیں۔ پہلی صفت برہما کی دوسری صفت اکاش کی۔ تیسری اس کی اپنی صفت ''سپرش'' (لمس) اس طرح وایو کی تین صفتیں ہوئیں۔

ا۔ 'ہے'۔ ۲۔ 'سید'۔ ۳۔ سپرش

وایو کے اپنے گن یعنی سپرش سے 'اگنی' (آگ) پیدا ہوئی۔ جس میں چار گن ہیں۔

ہے، شبد، سپرش اور روشنی۔

پہلا گن برہما کا، دوسرا گن آکاش کا، تیسرا گن وایو کا، چوتھا گن ......یعنی روشنی اگنی کے اپنے گن یعنی روشنی سے ''جل'' (پانی) تتو پیدا ہوا۔ جس کے پانچ گن 'ہے'۔ 'شبد'، سپرش'، 'روشنی' اور 'رس' (مزہ) ہیں اول گن برہما کا، دوسرا آکاش کا، تیسرا وایوں کا برہما کی صفت ''ہے'' روح سے متعلق ہے اور بعد کی پانچوں صفتیں اور پانچوں تتو نہ ہوتے تو یہ کائنات کا ہیولی تیار نہ ہوتا۔ وجود انسانی بھی انھیں پانچ تتوؤں سے قائم ہے۔ گرونانک کہتے ہیں۔

ع: پانچ تت کا پتلا کھیلے نانک میرا نان

ان پانچ تتوؤں کی اصلیت اور ماہیت پر غور کرنے سے کائنات کے سارے اسرار و رموز انسان پر منکشف ہوجاتے ہیں اور وہ پرتھوی سے عروج کر کے برہما تک پہنچ سکتا ہے''۔ (۲۳)

ہندو فلسفہ کا ایک نظریہ م۔ ن۔ سعید نے ویدک دور کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

برہادان یاکا اور چندودیا اپنیشد میں آکاش، ہوا اور آگ کو ازلی بتایا گیا ہے جن سے اس کائنات کا ظہور ہوا۔ اسی میں ایک اور مقام پر یہ خیال پیش کہا گیا ہے کہ وجود ازلی اکیلا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیا میں

زیادہ مظاہر میں اپنے آپ کو ظاہر کرسکتا ہوں۔ پھر اس سے آگ نکلی۔
آگ نے اسی طرح مزید مظاہر کی تمنا کی۔ اس کے نتیجہ میں پانی پیدا
ہوا۔ اور اسی طرح دوسرے عناصر کا ظہور ہوا۔ جس سے کائنات کی
تکوین ہوئی۔ تائی نیریا اپنیشد میں کہا گیا ہے کہ پہلے صرف وجود ازل
تھا۔ اس سے خلا پیدا ہوا اور خلاء سے ہوا، ہوا سے آگ، آگ سے پانی
اور پانی سے مٹی پیدا ہوئی۔ اور مٹی سے نباتات اور غذا پیدا ہوئی اور غذا
سے جانداروں کا وجود ہوا جس میں انسان بھی شامل ہے۔ چندودیا
اپنیشد میں ایک اور مقام پر کیا گیا ہے کہ پہلے صرف خلاء تھا۔ پھر خلاء
سے سب کچھ خلق ہوا۔ بالآخر سب کچھ خلا ہی میں فنا ہو جائے گا۔

سلبھ اپنیشد میں کہا گیا ہے کہ پہلے نہ عدم تھا نہ وجود تھا۔ اس
عدم نہ وجود سے اندھیرا خلق ہوا اور اندھیرے سے جوہر نکلا اور جوہر
سے خلاء اور خلاء سے بالترتیب ہوا، ہوا سے آگ، آگ سے پانی اور
پانی سے مٹی پیدا ہوئی۔ (۴۳)

اس سلسلے کے ایک اہم بزرگ محمود خوش دہا ہیں۔ آپ کا نام شیخ محمود ہے۔ لقب خوش دہاں۔ آپ کے والد کا اسم اعلیٰ شیخ داؤد قریشی ہے۔ آپ بدرالدین بدر عالم حبیب اللہ بیدری کے نواسے ہیں۔ قریب 960ھ بیدر میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی اور اپنے نانا کے ہاتھ پر بیعت فرمائی۔ خلافت اپنے ماموں شاہ ابوالحسن قادری سے حاصل کی۔ آپ کا تعلق قادری سلسلے سے ہے لیکن بیجاپور آنے کے بعد آپ نے میراں جی شمس العشاق سے بیعت فرمائی اور خلافت حضرت برہان الدین جانم سے ملتی ہے۔ شیخ محمود خوش دہاں دونوں ہی سلسلوں میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ (۴۲)

محمود خوش دہاں نے نظم ونثر دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اِن کے تصانیف میں رسالہ وجودیہ، رسالہ علم الحیات، رسالہ بیان برزخ کبریٰ، رموز الانور، محمود خوش دیاں اور تنبیہ الخلائق ہیں اور دو فارسی رسالے معرفت السلوک اور وجود العارفین وغیرہ ہیں۔ محمود خوش دہاں ان رسالوں کے ذریعے اپنے بزرگوں کی تعلیمات کو آگے

بڑھاتے ہیں۔ برہان الدین جانم نے وجود کے چار مراتب، واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الموجود اور عارف الوجود کو اپنے فلسفے میں پیش کئے لیکن ان کے تمام شرائط ولوازم کی کوئی تفصیل نہیں دی۔ جبکہ محمود خوش دہاں نے رسالہ ''معرفت السلوک'' اور ''رساہ وجود العارفین'' میں اس نظام تصوف اس قدر مرتب، مربوط اور منظّم انداز میں کئے ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد رسالہ ''معرفت السلوک'' اور ''وجود العارفین'' پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں وجود العارفین بھی بڑا کارآمد رسالہ ہے۔ اگر چہ معرفت السلوک کے عالمانہ اور تشفی بخش صراحتوں کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تاہم اختصار و جامعیت کے اعتبار سے اس کی افادیت مسلم ہے۔ معرفت السلوک کے مطالعے کی روشنی میں ایک مبتدی بھی جانم اور حضرت امین کے سلوک کو سمجھ سکتا ہے اور ان کے رسائل کے موضوع اور مضامین کو متعین کر سکتا ہے لیکن وجود العارفین سے وہی فائدہ اُٹھا سکتا ہے جو جانم اور امین کے تصوف سے پہلے ہی سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے۔ اس رسالے کے مطالعے سے جانم اور امین کے سلوک کے خط و خال تو اُجاگر ہو جاتے ہیں۔ اصطلاحات شرائط اور لوازم کے مفاہیم بھی ایک حد تک کھل جاتے ہیں۔ لیکن ان کا آپس کا ربط واضح نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے یہ بکھری ہوئی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ خوش دہاں کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جہاں ہر مرتبے، ان شرائط اور لوازم کو بڑی شرح و ربط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہیں ان ربط کو اس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ ان کا منطق اور معنوی تسلسل واضح ہو گیا ہے اور ان مدراج پر سے پردے ہٹ گئے ہیں جن پر جانم اور امین کے سلوک کے نظام کی عمارت کھڑی ہے''۔ (۲۵)

اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی حضرت امین الدین علی اعلیٰ ہیں۔ حضرت امین الدین علی اعلیٰ بیجاپور کے صوفیاء میں گل سرسید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ حضرت برہان الدین جانم کے فرزند تھے۔ والد کے چند ماہ بعد

1007ھ میں پیدا ہوئے۔ اسم عالی امین الدین علی تھا۔ تخلص اعلیٰ اور امین باندھا کرتے تھے۔ شیر خدا کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ مادرزاد ولی تھے۔ مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ایک زبان ہو کر لکھا ہے کہ آپ ''ولی کامل اور مجذوب واصل'' تھے۔

حضرت شیخ محمود خوش دہاں اور شیخ شاہ داول وغیرہ نے اپنے مرشد حضرت برہان الدین جانم کی وصیت کے مطابق حضرت امین الدین علی اعلیٰ کی تعلیم و تربیت انجام دی۔ حضرت امین الدین علی اعلیٰ نے اپنے والد کی امانتیں اور فرقہ اپنے چچا شاہ عطا اللہ سے حاصل کیا۔ امین الدین علی اعلیٰ فطری شاعر تھے۔ آپ کی نظم و نثر میں تصانیف یادگار ہیں۔ آپ کی حسب ذیل منظومات ملتی ہیں۔ ''جواہر الاسرار''، رموز السالکین، قربیہ، تاریزہ، وجودیہ، محبّ ناہ، مدح نشاہ برہان الدین جانم، خیال ریختہ، غزلی، سہیلا، در مدح درگاہ پیر دستگیر''۔ (۲۶)

حضرت امین الدین علی اعلیٰ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے برہان الدین جانم کے تصوف کی جس روایت کی ابتداء کی نہ صرف اُسے آگے بڑھائے بلکہ اس میں مزید اضافے بھی کیے۔ جانم نے اپنے تصوف میں صرف چار عناصر آب، آتش، خاک، و باد کا ذکر کیا ہے اور آکاش (خالی) کا ذکر نہیں کیا اور اِن عناصر کے گنوں کی تعداد بھی کم بتاتی ہے۔ اس کے برخلاف امین الدین علی اعلیٰ نے آب، آتش، خاک، باد اور خالی (آکاش) کو بھی شامل کیا ہے۔ ہندوستانی فلسفہ میں حالی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ حضرت امین ہندوستانی فلسفے کے اس تصور سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ انھوں نے اپنے نظام تصوف میں ان کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ حضرت امین نے عناصر کا وہاں بھی ذکر کیا ہے جہاں پانچ عناصر کا ذکر ملتا ہے۔ ان پانچ عناصر میں امین الدین علی اعلیٰ نے اُن کے گن، پھل، پھول، درد، مقام، دروازوں، جانوروں کے شاخ در شاخ کے پہلو اور ایک عنصر میں دوسرے عنصر کے دورے کو رسالہ وجودیہ میں پیش کیا ہے۔

عناصر کے گنوں کی تفصیل بموجب معرفت السلوک

عنصر	گن				
خاک	1	2	3	4	5
	لذت	بو	نموداری	لمس	خال
آب	لذت	نموداری	لمس	خال	

آتش	نموداری	لمس	خالی		
باد	لمس	خالی			
ہوا	خالی				

عناصر کے گنوں کی تفصیل بموجب رسالہ وجودیہ

عنصر	گن				
خاک	1	2	3	4	5
	ہڈ	ہیڑا	رگاں	چمڑا	ہال
آب	مغز	جلاب	خولے	اراخت	آب منی
آتش	بھوک	پیاس	سستی	تیند	ہضم
باد	ہلنا	چکنا	سوچنا	کانپتا	جمائی
خالی	مشہوت	مہر	بخیلی	غصّہ	دہشت(۲ے)

ہر عنصر کے دوسرے عنصر کے حوالے کی خاصیت

نام عنصر	آ کاش میں آ کاش	آ کاش میں وایو	آ کاش میں اگنی	اکاش میں جل	آ کاش میں پرتھوی
خاصیت	تکلیف	آرام	حیا	لالچ	خوف
نام عنصر	والو میں آ کاش	وایو میں وایو	وایو میں اگنی	وایو میں جل	وایو میں پرتھوی
خاصیت	بات کرنا	آرام	ڈرنا	بڑھنا	سمٹنا

نام عنصر	اگنی میں آکاش	آگتی میں وایو	اگنی میں اگتی	اگنی میں جل	اگنی میں پرتھوی
خاصیت	نیند کی خواہش	انگڑائی	بھوک	پیاس	سستی
نام عنصر	جل میں آکاش	جل میں وایو	جل میں اگنی	جل میں جل	جل میں پرتھوی
خاصیت	پتہ	مغز	ہو	پسینہ	تھوک
نام عنصر	پرتھوی میں آکاش	پرتھوی میں والو	پرتھوی میں اگنی	پرتھوی میں جل	رتھوی میں پرتھوی
خاصیت	بال	ماس	رنگیں	چمڑا	ہڈیاں (۲۸)

ان خاکوں کی نشاندہی اس لئے کی گئی ہے تا کہ برہان الدین جانم اور امین الدین علی اعلیٰ کے نظام تصوف کا فرق سمجھ میں آسکے۔ امین الدین علی اعلیٰ نے پانچ عناصر کا ذکر کئے ہیں وہی ایک عنصر کا دوسرے عنصر کے دورے کی تفصیل بھی دی ہے کیوں کہ امین الدین علی اعلیٰ کا کہنا ہے کہ انسان کا وجود انھیں پانچ تتوں پر مبنی ہے اور انھیں پانچ تتو پر غور کرنے کائنات کے سارے اسرار کھل جاتے ہیں اور ایک دن انسان پرتھوی (زمین) سے عروج کر کے برہما (آکاش) میں پہنچ جاتا ہے۔

برہان الدین جانم نے اپنے فلسفہ میں وجود کے چارتن، واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود، عارف الوجود کا ذکر کیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت امین نے وجود کے پانچ تن، واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود، عارف الوجود اور واحد الوجود کا نہ صرف ذکر کرتے بلکہ ان کے لوازم وشرائط کی بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ یہاں پر وجود کے پانچ تن کا خاکہ دیئے جائیں گے تا کہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے فلسفے واضح ہوسکے۔

برہان الدین جانم نے جس تصوف کی ابتداء کی اُس تصوف کے لوازم وشرائط بیان نہیں کئے۔ جبکہ امین الدین علی اعلیٰ نے اِس نظام تصوف کو نہ صرف آگے بڑھائے بلکہ اس کے لوازم وشرائط اور نئی نئی اصطلاحیں بھی

دیں۔ یہ تصوف دراصل امین الدین علی اعلیٰ کی جدت اور فکر و نظر کی مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا تصوف پانچ عناصر پچیس گن کا تصوف کہلانے لگا اور یہی تصوف ایک مدت تک دکن میں مقبول بھی رہا۔ اس تصوف کو خانوادۂ امینیہ کے کئی بزرگوں نے اپنے رسالوں میں قلمبند کیا ہے اور یہ تصوف گیارہویں صدی سے پہلے سے تعلق نہیں رکھتا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معراج العاشقین میں جو تصوف کا ذکر ہوا ہے، اُس کا تعلق حضرت خواجہ بندہ نواز سے کیسے ہوسکتا ہے۔ معراج العاشقین کے پہلے مرتب مولوی عبدالحق کو بھی قطعیت کے ساتھ اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ یہ رسالہ حضرت بندہ نواز ہی کا ہے۔ کچھ وجوہات کی بناء پر مولوی عبدالحق نے اس رسالے کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب کردیئے ہیں۔ اس کی سب سے پہلی وجہ ڈاکٹر محمد قاسم کے نسخے کا ترقیمہ ہے۔ مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''نسخہ شریف رافقیر قصیر سراپا تقصیر سید محمد نصیر در قلعہ نصرت آباد ساگر من مضافات دارالظفر بیجاپور تاریخ ہفتم ماہ رمضان المبارک سنہ 1176ھ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و شش ہجری از نسخہ تیر کہ قدیم کہ مکتوبہ سنہ 906ھ نہ صد و شش ہجری بود نقل نود''۔(۳۰)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مخطوطے کا آغاز، اختتام یا ترقیمہ سنہ تصنیف، مصنف کا نام موجود ہو تو محقق کی ساری اُلجھنیں دور ہوجاتی ہیں۔ جب مولوی عبدالحق کو ڈاکٹر محمد قاسم کا نسخہ ملا، جس میں اور ترقیمہ کے مطالعہ سے کاتب کا نام، (محمد نصیر)، سنہ کتابت (1176ھ)، اور یہ نسخہ جس نسخے سے نقل ہوا ہے اس کا سنہ (906ھ) ہے۔ اُنہی وجوہات کو مدنظر رکھ کر مولوی عبدالحق نے اس نسخے کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب کردیا۔ مگر ڈاکٹر حفیظ قتیل 906ھ پر اختلاف کرتے ہیں۔ اس اختلاف پر بحث کرتے ہوئے تین قیاس دیئے ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل کے ان قیاسوں کو بطور اقتباس دیئے جاتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پہلی بار تو یہی ہے کہ ڈاکٹر محمد قاسم کے نسخہ کے کاتب محمد نصیر اپنے منقولہ نسخہ کا سنہ کتابت ہندسوں میں 1174ھ لکھنے کے بعد ہندسوں کو عبارت میں بھی لکھا ہے۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ جس نسخہ

سے محمد نصیر نے نقل کیا ہے اس کا سنہ کتابت 906ھ صرف ہندسوں میں ہوگا۔ محمد نصیر نے ہند سے نقل کرنے کے بعد اس کو بھی عبارت میں لکھ دیا اور 906ھ کے ہندسوں کے بارے میں قیاس یہ ہے کہ خود یہ نسخہ جس پر سنہ کتابت 906ھ لکھا ہے کسی ایسے نسخے سے منقولہ ہے جس پر صرف 4 مندرج ہوگا اور چونکہ یہ رسالہ نام کے التباس سے بندہ نواز سے منسوب ہو چلا ہے اس لئے ناقل نے اس قیام سے کام لے کر 906ھ لکھ دیا۔

دوسرا قیاس یہ ہے کہ کاتب محمد نصیر نے معراج العاشقین کے جس نسخہ سے نقل کیا ہے اس نسخہ پر سنہ صرف 94ھ ہوگا۔ لیکن کتابت میں سنہ کے نوں کا نقطہ 4 اور 9 کے درمیان آ گیا ہوگا جیسے 906ھ محمد نصیر نے اس کو 906ھ پڑھا اور اس کو ہندسوں کے علاوہ عبارت میں بھی لکھ دیا۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو یہ سنہ 1096ھ ہوگا اس لئے کہ محمد نصیر نے اس نسخہ کی نقل 1176ھ میں کی۔

تیسرا قیاس یہ ہے کہ کاتب صرف سال کا سنہ 96ء لکھنا چاہتا ہوگا لیکن سہواً 906ھ لکھ گیا۔ (۱۳)

ڈاکٹر حفیظ قتیل کے ان قیاسوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ایک متن کو مرتب کرتے وقت محقق کو مخطوطے میں موجود ہر لفظ پر شک کریں۔ یہ محقق کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے صرف 906ھ کو دیکھ کر رسالہ معراج العاشقین کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب کر دیا۔ اگر مولوی عبدالحق 906ھ پر ذرا سا بھی شک کرتے تو رسالہ معراج العاشقین کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے کبھی منسوب نہیں کرتے۔

رسالہ معراج العاشقین کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب کرنے کی دوسری وجہ نام ہے۔ معراج العاشقین دراصل کوئی مستقل رسالہ نہیں بلکہ تلاوۃ الوجود کا خلاصہ یا تلخیص ہے اور یہ تلخیص بھی سلیقے سے نہیں کی گئی ہے۔ تلاوۃ الوجود کے کئی رسالے موجود ہیں جس پر ''سید مخدوم حسینی'' نام ہے۔ دراصل 'مخدوم، شہباز،

صدرالدین، بندہ نواز گیسو دراز کے لقب ہیں۔ جس کی پوری بحث ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی تصنیف ''معراج العاشقین کا مصنف'' میں کی ہے اور ساتھ ہی وہ تمام نسخوں کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں مخدوم حسینی، مخدوم جیسے نام بھی آئے ہیں۔ اسی نام کی وجہ سے کاتبوں نے معراج العاشقین کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب کر دیئے۔ مگر اِس رسالے کے مصنف سید مخدوم شاہ حسینی بلکا نوری ہیں وہ پیر اللہ حسینی سے بیعت وخلافت تھے۔ پیر اللہ حسینی میراں جی خدانما کے مرید وخلیفہ گزرے ہیں۔ مخدوم شاہ حسینی کثیر التصانیف بزرگ گزرے ہیں۔ نظم ونثر میں کئی رسالے موجود ہیں لیکن مخدوم شاہ حسینی نام کی وجہ سے ان کے کئی رسالوں کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب کر دیئے۔

رسالہ معراج العاشقین کا موضوع تصوف ہے جو حضرت خواجہ بندہ نواز کے عہد سے دور کرتا ہے۔ (اِس رسالے کا موضوع پانچ عناصر پچیس گن ہے اور یہ تصوف چشتیہ سلسلے کے بزرگ برہان الدین جانم سے شروع ہوتا ہے) کیوں کہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے سلسلے کے کسی بزرگ نے اس فلسفے کو بیان نہیں فرمایا۔ یہ نظام تصوف برہان الدین جانم اور حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے یہاں مرتب ہوا ہے۔ برہان الدین جانم سے حضرت امین نے اس فلسفے میں کچھ نئے نکات، نئی اصطلاحیں اور نئی تعبیریں پیش کی ہیں۔ حضرت امین الدین علی اعلیٰ نے ہر عنصر کے ذکر کے ساتھ اُن کے پانچ پانچ گن بھی گنوائے ہیں اور انسان کے وجود کا ذکر جس میں ذکر جلی، ذکر قلبی، ذکر روحی اور ذکر سری کے گن کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ تمام فلسفہ معراج العاشقین میں بیان ہوا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس رسالے کے مصنف کا براہ راست تعلق حضرت خواجہ بندہ نواز سے نہیں بلکہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولوی عبدالحق معراج العاشقین کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب کرنے کی ایک اور وجہ اِس رسالے کی زبان اور عبارت ہے۔ انھوں نے اس رسالے کی زبان کو نویں صدی ہجری کی زبان قرار دیئے ہیں کیوں کہ اس کی ایک وجہ تو اس رسالے میں موجود انوکھی اصطلاحیں، متن میں بے ربطی اور جملوں میں اُلجھاؤ ہے۔ دراصل اِس رسالے میں جو تصوف بیان ہوا ہے وہ عام تصوف سے مختلف بھی ہے اور مشکل بھی۔ مولوی عبدالحق نے اس تصوف کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جس کا اعتراف کرتے ہوئے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

''سوءِ اتفاق سے یہ دونوں نسخے بہت غلط، بداملا اور بدخط ہیں۔

اگرچہ پرانی دکنی کتابیں پڑھتے پڑھتے مجھے اس کام کی دکان آ گئی ہے۔
تاہم اس مسخ شدہ اور غلط نسخوں کی تصحیح میں بہت دقت پڑی۔ بعض بعض
جملوں اور لفظوں کی تصحیح میں کئی کئی گھنٹے لگ گئے۔ کہیں قیاس سے کام
نکل آیا اور کہیں سیاق عبارت سے۔ باوجود اس کے اب بھی بعض
مقامات مشکوک اور قابلِ تصحیح رہ گئے ہیں''۔(۳۲)

جہاں مولوی عبدالحق کو اس رسالے کی عبارت سمجھنے میں مشکل ہوئی وہیں اس رسالے کے متن کو پڑھنے اور سمجھنے میں بھی تسامح ہوا ہے۔ اگر مولوی عبدالحق بیجاپوری تصوف سے واقف ہوتے تو اِس کو سمجھنے میں اُن سے یہ غلطیاں کبھی نہیں ہوتیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''واجب کی اَنک سوں غیر نہ دیکھا سو۔ حرص کے کان سوں غیر
نہ سننا سو۔ حسد نک سوں بدبوئی نہ لیتا سو۔ بعض کے زبان سوید بوئی نہ
لینا سو۔ کہنا کے شہوت کوں غیر جاگا خرچنا سو''۔(۳۳)

اِس عبارت کے ہر جملے میں نہ کا اضافہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کاتب کی کم سوادی کا نتیجہ ہے۔ جس پر مولوی عبدالحق نے ذرا بھی توجہ نہ کی۔ مگر ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب ''معراج العاشقین کا مصنف'' میں اِس عبارت کی تصحیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''واجب کی انکھیاں سوں غیر نہ دیکھنا سوں حرص کان سوں غیر
سننا سو حسد ناک سوں بدبوئی لینا بعض زبان سوں بد بلنا سو کنیا شہوت
غیر جاگا خرچ کرنا سو کبر''۔(۳۴)

اِس طرح مولوی عبدالحق ان وجوہات پر ذرا بھی توجہ کرتے تو رسالہ معراج العاشقین کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے کبھی منسوب نہیں کرتے۔ ایک محقق کو کسی متن کو مرتب کرتے وقت ایک مخطوطے میں موجود تمام نکات پر نظر ڈالیں اور ہر پہلو سے اس کی جانچ کریں۔ کیوں کہ ترتیب متن میں محقق کی ذراسی لاپرواہی تحقیق کے کئی راستے بند کر دیتی ہے اور یہی معراج العاشقین کے ساتھ بھی ہوا۔ 1967ء تک رسالہ ''معراج العاشقین'' کو حضرت خواجہ بندہ نواز کی ہی تصنیف سمجھی گئی اور اس عرصے میں کئی اساتذہ نے اسے پڑھا اور پڑھایا اور کئی محققین نے اس کا حوالہ بھی دیا۔

حوالے

1- حضرت خواجہ بندہ نواز ۔معراج العاشقین ۔مرتب مولوی عبدالحق ۔ص 4۔1924ء

2- ایضاً ص ۔1924ء

3- جمیل جالبی ڈاکٹر۔تاریخ ادب اُردو جلد اوّل ۔ص210۔1977ء

4- حضرت خواجہ بندہ نواز ۔معراج العاشقین ۔مرتب: گوپی چند نارنگ ۔ص 9۔1957ء

5- حضرت خواجہ بندہ نواز ۔معراج العاشقین ۔مرتب: خلیق انجم،ص 13،1957ء

6- جمیل جالبی ڈاکٹر۔تاریخ ادب اُردو، جلد اوّل،ص158،1977ء

7- رفیعہ سلطانہ ڈاکٹر۔اُردو نثر کا آغاز وارتقاء ص86۔1978ء

8- حفیظ قتیل ڈاکٹر۔معراج العاشقین کا مصنف ص9۔1968ء

9- ایضاً ص9

10- ایضاً ص12

11- ایضاً ص14

12- ایضاً ص25-24

13- ایضاً ص30-29

14- ایضاً ص91

15- عبدالحفیظ قتیل۔میراں جی خدا نما ص31-30۔1961ء

16- نسیم الدین فریس ڈاکٹر۔

17-

18- گیان چند جین پروفیسر۔سیدہ جعفر پروفیسر۔ص۔ص

19-

20- حبیب نثار ڈاکٹر۔ عادل شاہی دور، مضمون مشمولہ ''اُردو کی ادبی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ، مدیر، پروفیسر محمد انورالدین ص 50۔2011ء

21- جمیل جالبی ڈاکٹر۔تاریخ ادب جلد اوّل۔ص210، 1977ء

22- حسینی شاہد ڈاکٹر۔سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے 164-163۔1973ء

23- م۔ن۔سعید ''بیجاپور کا نظام تصوف: ہندو اسلامی روحانیت کا نفیس امتزاج'' سہ ماہی نوائے ادب اپریل تا ستمبر۔ 47۔2009ء

24- حبیب نثار ڈاکٹر ''عادل شاہی دور'' مضمون مشمولہ ''اُردو کی ادبی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ، مدیر۔ پروفیسر محمد انورالدین، ص51، 2011ء

25- حسینی شاہد ڈاکٹر۔سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص174، 1973ء

26- حبیب نثار ڈاکٹر ''عادل شاہی دور'' مضمون مشمولہ ''اُردو کی ادبی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ'' مدیر۔ پروفیسر انورالدین ص53،ص2011ء

27- حسینی شاہد ڈاکٹر۔سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص189، 1973ء

28- ایضاً ص166

29- ایضاً ص

30- حضرت خواجہ بندہ نواز۔معراج العاشقین۔مرتب مولوی عبدالحق ص 4، 1924ء

31- حفیظ قتیل ڈاکٹر ''معراج العاشقین کا مصنف'' ص 106-104، 1968ء

32-

33- خلیق انجم ڈاکٹر ''معراج العاشقین'' ص 61۔1957ء

34- حفیظ قتیل ڈاکٹر۔ ''معراج العاشقین کا مصنف'' ص 7۔1968ء

باب چہارم
مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی کی نثری تصانیف
(ب) سب رس

وجہی گولکنڈہ کا ایک عظیم شاعر اور نثر نگار گذرا ہے۔ 1960 ء سے اب تک جو تحقیق ہوئی ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ وجہی ابراہیم قطب شاہ کے آخری عہد میں یعنی 973ھ تا 974ھ کے درمیان گولکنڈہ میں پیدا ہوا۔ اُس کا اصل نام اسداللہ اور وجہی تخلص (۱) تھا۔ وجہی 1012ھ میں قطب شاہی دربار سے وابستہ ہوجاتا ہے۔(۲)۔ اور وہ محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء قرار دیا جاتا ہے۔ مگر محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد وجہی قطب شاہی دربار سے دور ہوجاتا ہے اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ جب عبداللہ قطب شاہ 1035ھ میں تخت نشین ہوا تو وجہی کے اچھے دن لوٹ آئے۔ وجہی کے دکنی میں تین تصانیف ''قطب مشتری'' 1018ھ، ''سب رس'' 1045ھ اور ''تاج الحقائق'' ملتی ہیں۔ اختر حسن نے اُس کے فارسی دیوان کا تعارف اپنے ایک مضمون مطبوعہ رسالہ ''سب رس'' 1959ء میں کروایا۔ جو بعد ازاں اُن کے مضامین کے مجموعہ ''نقد و نظر'' (مطبوعہ 1984ء) میں شائع ہوا ہے۔

''سب رس'' دکنی زبان کی ایک اہم تصنیف ہے جس کو وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1045ھ 1635ء میں تصنیف کی ہے۔ سب رس دراصل ایک عشقیہ قصہ ہے۔ جس میں حسن و دل کی عشق کی داستان کو تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس کے تمام کردار تمثیلی ہیں جیسے نظر، دل، عشق، ناموس، حسن، ناز، غمزہ اور رقیب۔ سب رس کی زبان مسجع و مقفّٰی ہے اور وجہی نے اس میں صنائع و بدائع کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔ سب رس کے قصّے میں دو تہیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ ظاہری جس میں مجازی عشق کی داستان ہے اور باطنی میں عشق حقیقی اس طرح ''سب رس'' میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کو ایک ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جہاں اس قصّے میں دو تہیں ہیں۔ وہیں ''سب رس'' کے قصّے کے دو پہلو بھی ہیں ایک عشقیہ قصّہ اور دوسری طرف انشائیہ۔ وجہی کو جہاں بھی موقع ملا وہاں انشاپردازی کے جوہر دکھائے ہیں اور کسی ایک عنوان پر صفحے کے صفحے لکھ دیا ہے۔ کبھی دل کی حقیقت بیان کرتا ہے تو کبھی عشق کے بھید کو کھولتا ہے، تو کبھی عقل، شراب اور حسن پر صفحے کے صفحے بھر دیتا ہے۔ اس داستان میں جہاں اخلاقی، معاشی اور مذہبی مسائل کو پیش کیا ہے وہیں وجہی نے اپنے دور کے تہذیبی عناصر کی بھی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ ''سب رس'' کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وجہی فارسی، عربی ادبیات کے علاوہ ہندوستانی زبانوں اور یہاں کے ادب سے بھی اچھی واقفیت رکھتا تھا۔ اُس نے جگہ جگہ احادیث، آیات اور دکنی، فارسی اور عربی کے اشعار سے سب رس کے قصّے کو سنوارنے کی کوشش

کی ہے اوراس میں ضرب الامثال، روزمرہ کی زبان اورمحاورے کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ''سب رس'' میں قصّہ درقصّہ کا بیان نہیں ملتا۔ بلکہ ایک ہی قصّے کوابتداء سے آخرتک پیش کیا گیا ہے۔

سب رس کے کئی نسخے مختلف مقامات میں ملتے ہیں۔ سالار جنگ میں سب رس کے دو نسخے، آصفیہ لائبریری میں دو، ادارہ ادبیات اُردو میں چاراور پاکستان میں دو نسخے ملتے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے:

1- ''نمبر (37)، سائز (6x9)، صفحہ (263)، سطر (14 تا 16)، خط نستعلیق، کاغذ دیسی، مصنف۔ وجہی، تاریخ تصنیف 1045 ھ، کتابت 1275 ھ، وجہی کا نام وجیہہ الدین اور تخلص وجہی تھا۔ بڑا خوش نصیب اورخوش قسمت شخص ہے کہ اُس کی نظم ونثر دونوں کے نمونے ہمدست ہوتے ہیں۔

آغاز: تمام مصحف کا معنی الحمدللہ میں ہے۔ مستقیم۔ ہور تمام الحمداللہ کا معناً بسم اللہ میں ہے۔ قدیم، ہور، تمام بسم اللہ کا معنا بسم اللہ کے نقطے میں رکھا ہے کریم، سمجھ دیکھ خاطر لیا۔

اختتام: رزق فراغ اچھو۔ ہمیشہ بعیش وعشرت اچھو، عمر دراز اچھو، دائم بدولت اچھو، عاقبت بخیر اچھو، ایمان سلامت اچھو، آمین رب العالمین۔

''خاتمہ: نسخہ سب رس میں سن تصنیف میاں مولانا وجہہ الدین قدس سرہٗ، بتاریخ بست وہشتم روز پنجشنبہ ماہ ذیقعدہ 1275 ھ تمام شد، حسب خواہش فقیر حقیر فخر الحق والدین علوی از دست محبّ الفقراء واقف اسرار اللہ الہم'' (۳)

2- نمبر (38)، سائز (5x9)، صفحہ (141)، سطر متن (13)، حاشیہ (25)، خط نستعلیق کاغذ دیسی، کرم خوردہ، کتابت 1073 ھ، آغاز۔ تمام مصحف کا معنا الحمداللہ میں مستقیم، تمام الحمداللہ کا معنا بسم اللہ

میں قدیم۔

اختتام: ہمیشہ بعیش وعشرت اچھو، عمر دراز۔ اچھو، دائم بدولت اچھو، عاقبت بخیر اچھو، ایمان سلامت اچھو، امین رب العالمین۔

خاتمہ: نسخہ سب رس تصنیف میاں وجہی قدس سرہ بتاریخ بست وپنجم ربیع الثانی 1073ھ روز یکشنبہ درمحسنہ نہاد باتمام رسید، کاتب الحروف فقیر پرتقصیر واصل حیدری یادگاری نوشتہ شد، ہرگاہ کہ ایں نسخہ رانجوانجد، فاتحہ خیر بنام خاک یا ہیچ مندان''۔(۴)

آصفیہ:

1- ''نمبر تصوف (95)، سائز (8x92)، صفحہ (125)، سطر (24)، خط شکستہ، مصنف وجہی، تاریخ تصنیف 1045ھ، کتابت 1295۔

آغاز: تمام مصحف کا معنی الحمداللہ میں ہے، مستقیم ہوا تمام الحمداللہ کا معنیٰ بسم اللہ میں ہے قدیم۔ تمام بسم اللہ کا معنیٰ الحمداللہ کے نقطہ میں رکھا ہے کریم۔

اختتام: عمر دراز اچھو، دائم بدولت اچھو، عاقبت بخیر، اچھوایمان سلامت، اچھوامین رب العالمین، ترقیمہ: الحمداللہ المنہ بحق حبیب کتاب سب رس تصنیف، حضرت وجہہ الدین رحمۃ اللہ بتاریخ شانزدہم روز سہ شنبہ شہر صفر المظفر 1295ھ بہ اختتام رسید''۔(۵)

2- نمبر تصوف (632)، سائز (6x10)، صفحہ (268)، سطر (16x13)، خط نستعلیق۔

آغاز: تمام مصحف کا معنی الحمداللہ میں ہے مستقیم، ہوا تمام الحمداللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم، اختتام میری آشنائی کا نہیں رکھے

شرم کچھ......''(٦)

افسر صدیقی امروہوی نے اپنی تصنیف ''مخطوطات انجمن ترقی اُردو (پاکستان) میں ''سب رس'' کے دو نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہ دونوں نسخے بہت اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ مولوی عبدالحق نے انہی دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر ''سب رس'' کو ترتیب دیا ہے۔

1- ''سائز (5x8)، صفحات (230)، سطور (15)، سنہ تصنیف1045ھ، سنہ کتابت1171۔

آغاز: تمام بسم اللہ کا معنا الحمداللہ میں ہے مستقیم، اور تمام الحمداللہ کامعنا بسم اللہ میں ہے قدیم، اور تمام بسم اللہ کا معنا، بسم اللہ کے نقطے میں لکھا ہے کریم،

اختتام:

پادشاہاں کے خدمتگاراں ۔۔۔ دولتخواہاں، دعا گویاں امیدواراں
سب اپنے مراد کوں انپر و، ۔۔۔ انوکوں غیب کی نعمت سنپر د
رزق فراق اچھو، ۔۔۔ ہمیشہ بعیش و عشرت اچھو
عمر دراز اچھو، ۔۔۔ دریم بدولت اچھو
عاقبت بخیر اچھو ۔۔۔ ایمان سلامت اچھو

آمین رب العالمین

(پاکستان)

ترقیمہ:

الحمداللہ کہ نسخہ س رس پچیسویں جمادی الاول 1171 ھ روز اتوار در قلعہ مبارک دولت آباد تمام ہوئی تصنیف میاں وجہی قدس سرہ بخط فقیر پُرتقصیر محمد واصل جیلانی بجہتہ یادگار نوشتہ شد۔ ہر وقتے کہ بخواند یک فاتحہ خیر بنام خاک پا بخشد۔

من نوشتم صرف کردم روزگار　　　من نمانم خط بماند یادگار
نوشتہ بماند سب برسفید　　　نو پسندہ را نیست فرد(۷)

2- ''سائز 8½ × 4½)، صفحات (277)، سطر (17)، سنہ تصنیف 1045ھ، سنہ کتابت 1177ھ۔

سب رس کا یہ مخطوطہ پہلے مخطوطے سے 6 سال بعد لکھا گیا۔ اس کی تحریر نستعلیق ہے۔ پہلے نسخے کی طرح فقرات کو مثلثی نشان (...) سے جدا کیا گیا ہے۔ بابائے اُردو نے دونوں نسخوں کا تقابل کر کے متروک الفاظ اور جملوں کو پنسل سے حاشیے پر بڑھا دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سب رس کی کتابت اسی مسودے سے کرائی گئی تھی۔ کیوں کہ آخر تک مطبوعہ سب رس کے صفحات حاشئے پر درج ہیں۔ اصل سے قبل ایک صفحہ پر بابائے اُردو نے کتاب کا نام، مصنف کا نام، سنہ تصنیف اور سنہ کتابت پنسل سے لکھ کر قلم سے اپنے دستخط کر دیئے ہیں۔

اختتام: ختم الکتاب چہار دہم شہر رجب المرجب 1177ھ یوم چہار شنبہ، سب رس کا اختتام صفحہ 275 پر ہو گیا ہے۔ اس سے اگلے صفحہ پر ایک دعا لکھی ہوئی ہے اور صفحہ 277 پر فارسی کی ایک عبارت مع رباعی درج ہے۔

شاہا ز شمار راحت جاں می طلبم　　　رندانہ دوا از تو نہاں می طلبم
از ہر چہار مصرع یکے حرف بگیر　　　بنگر کہ چہ چیز است، ہماں می طلبم

ترقیمہ: تمت الکتاب بعون اللہ ملک الوہاب بتاریخ چہار دہم رجب المرجب یوم چہار شنبہ 1177ھ نبویہ''۔(۸)

1- مخطوطہ نمبر 536، سب رس، ملا وجہی 1045ھ، اوراق 133، سطور 11، خط ثلث، اور نستعلیق، تختی 8½x6(۹)

2- مخطوطہ نمبر 694، سنہ کتابت 1183ھ، کتابت شاہ محبّ اللہ چشتی بخاری ان سید فضل اللہ بخاری چشتی القادری الدہلوی'' ورق 85، سطور 14۔ سائز 6x8،(۱۰)

3- مخطوطہ نمبر 900، سنہ کتابت 1196ھ، خط ثلث اور نستعلیق، کتابت، غلام حسین، اوراق 67، سطور 22، سائز 8x5۔(۱۱)

مولوی عبدالحق اُردو کے پہلے محقق ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مضمون ''اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب'' رسالہ اُردو اکتوبر 1924ء جلد چہارم کے شمارے میں ''سب رس'' کا تعارف کروایا اور اس مضمون میں مولوی عبدالحق نے ''سب رس'' کو اُردو نثر کی قدیم تصنیف قرار دی تھی لکھتے ہیں۔

> ''اُردو زبان کے تذکرہ نویسوں نے اُردو نثر کی سب سے پہلی کتاب شاہ فضل اللہ فضلی کی وہ مجلس بتائی ہے جو کریل کتھا کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ کتاب محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں سنہ 1145ھ میں رکھی گئی۔ اس وقت تک کوئی دوسری کتاب نثر کی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے تقدیم کا فخر اسی کو حاصل ہوا۔ میں ایک مدت سے اُردو زبان وادب کی تاریخ کے لئے سامان بہم پہنچا رہا ہوں۔ اس تحقیق وجستجو میں بہت سی قدیم نظم ونثر کی ایسی کتابیں دستیاب ہوئیں جو بالکل نایاب ہیں اور ہمارے خواب وخیال میں بھی نہ تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب ''سب رس'' ہے۔(۱۱)

جہاں تک اُردو نثر کے ارتقاء کا سوال ہے۔ اس ضمن میں مختلف محققین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں فضل کی ''کربل کتھا'' کو اُردو نثر کی پہلی تصنیف قرار دی۔ ان کے بعد مولوی عبدالحق حضرت خواجہ بندہ نوازؒ گیسودراز کی تصنیف ''معراج العاشقین'' کو اُردو نثر کا پہلا کارنامہ کیا ہے۔ 'معراج العاشقین' کو مولوی عبدالحق نے 1932ء میں اپنے مقدمہ کے ساتھ اسے شائع بھی کیا۔ مگر بعد میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی تصنیف 'معراج العاشقین' کا مصنف 1967ء میں اس بات کا اعتراض کیا کہ

''معراج العاشقین'' حضرت خواجہ بندہ نواز کی نہیں بلکہ گیارہویں صدی ہجری کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی جو میراں جی خدانما کے مرید اور خلیفہ گذرے ہیں جو اُن کی تصنیف ہے۔ اس طرح خواجہ بندہ نواز کی اوّلیت بحیثیت پہلے نثر نگار اور ''معراج العاشقین'' کی اولین بحیثیت پہلے نثری کارنامہ کے ختم ہو جاتی ہے۔

مولوی عبدالحق نے مضمون ''اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب'' میں وجہی کی حالات زندگی، سب رس کے قصہ کا خلاصہ، سب رس کی زبان اور مخطوطات کی تفصیل دی ہے۔ ''سب رس'' کے مخطوطات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(یہاں پر حسینی شاہد کا اقتباس آنا ہے)............(۱۲)

''مجھے اس کتاب کے دو نسخے دستیاب ہوئے۔ کئی سال ہوئے حیدرآباد میں ملا اور دوسرا بیجاپور میں۔ دونوں نسخے خوش خط اور بہت صاف ستھرے لکھے ہوئے ہیں جس سے مجھے مقابلہ اور صحت میں بہت مدد ملی۔ یہ دونوں نسخے تقریباً ایک صدی بعد کے لکھے ہوئے ہیں''۔(۳۱)

آگے مخطوطات کی سنہ کتابت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الحمداللہ کہ نسخۂ ''سب رس'' پچیسویں جمادی الاول سنہ 1171ھ روز اتوار در قلعہ مبارک دولت آباد تمام ہوئی۔ تصنیف میاں وجہی قدس سرہ۔ تمت الکتاب بعون اللہ ملک الوھاب بتاریخ چہاردم رجب المرجب یوم چہار شنبہ سنہ 1177ھ نبویہ''۔(۱۴)

مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون میں ''سب رس'' کے دو نسخے ایک حیدرآباد (1171ھ) اور دوسرا بیجاپور (1177ھ) کا ذکر کیا ہے۔ ان اقتباسات کے مطالعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''سب رس'' کے دونوں نسخے خوش خط اور صاف ستھرے ہیں اور مضمون میں کہیں بھی نسخے ناقص ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔

''سب رس'' کی سنہ تصنیف میں کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ وجہی نے خود سب رس میں سنہ تصنیف لکھ دیا ہے۔

''بارے جس وقت تھا ایک ہزار وچہل و پنج اس وقت ظہور پکڑیا یو گنج''۔(۱۵)

لیکن مولوی عبدالحق نے مضمون (اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب) میں ''سب رس'' کی سنہ تصنیف پر شک کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سلطان عبداللہ ساڑھے گیارہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنہ 1040ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔یعنی فضل کی وہ مجلس سے تخمیناً ایک صدی قبل کی سمجھنی چاہئے۔غواصی بھی اسی عہد کا ایک مشہور شاعر اور میاں وجہی کا ہم عصر ہے۔اس کی مثنوی ''طوطی نامہ'' کا سنہ تصنیف 1027ھ اور ایک دوسری مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' کا سنہ1035ھ ہے۔ سب رس بھی اسی کے لگ بھگ لکھی گئی ہے''۔(۱۶)

جب مولوی عبدالحق نے ''سب رس'' کو 1932ء(انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد) کو اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تو بنا کسی شک کے ''سب رس'' کے مقدمے میں سنہ تصنیف لکھ دی۔سنہ تصنیف پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب رس کا سنہ تصنیف 1045ھ ہے۔چنانچہ خاتمہ کتاب میں لکھتا ہے۔''بارے جس وقت تھا ایک ہزار چہل پنج،اس وقت ظہور پکڑ بابہ گنج''،یعنی اُس نے ''سب رس'' مذکورہ مثنوی سے 27 برس بعد لکھی''۔(۱۷)

مولوی عبدالحق نے مضمون ''اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب'' میں ''سب رس'' کی سنہ تصنیف پر شک ظاہر کیا۔وہی جب ''سب رس'' کو 1932ء میں شائع کیا تو بنا کسی شک وشبہ کے ''سب رس'' کی سنہ تصنیف لکھ دی۔یہاں دو نکات ہو سکتے ہیں۔

1- مولوی عبدالحق نے مضمون (اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب) کے وقت ''سب رس'' کے نسخوں کا مطالعہ

سرسری کیا ہو۔

2-اور دوسرا سید محی الدین قادری زور کی تصنیف ''اُردو شہ پارے جلد اوّل'' جو 1929ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی تھی جو مولوی عبدالحق کے نظروں سے گذر چکی ہو جس کا ذکر کرنا مولوی عبدالحق نے ضروری نہیں سمجھا۔

سید محی الدین قادری زور نے اپنی تصنیف ''اُردو شہ پارے جلد اوّل'' میں مثنوی قطب مشتری اور ''سب رس'' پر تفصیلی بحث کی تھی۔ لکھتے ہیں:

> ''قطب مشتری جیسا کہ مثنوی کے آخری شعروں سے ظاہر ہے۔ 1018ھ کی تصنیف ہے اور سب رس کے تقریباً 27 سال بعد یعنی 1045ھ میں لکھی گئی۔ دو کتابوں کی تصنیف کے زبانوں میں اس قدر زیادہ فرق کا پایا جانا مصنف کے ایک ہی ہونے کے متعلق شبہ پیدا کر دیتا ہے......
>
> ''سب رس'' کا وجہی غواصی کا ہم عصر کیوں کہ ''سب رس'' کا سن تصنیف 1045ھ ہے اور ''طوطی نامہ'' اور سیف الملوک کے سنین تصنیف 1049ھ اور 1035ھ ہیں''۔(۱۸)

''سب رس'' کو مولوی عبدالحق نے 1932ء میں مرتب کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) سے شائع کیا۔ مولوی عبدالحق نے ''سب رس'' کو چار نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا ہے۔ چنانچہ مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''مدت ہوئی مجھے اس کتاب کے دو نسخے دستیاب ہوئے تھے۔ ایک حیدر آباد میں دوسرا بیجاپور میں۔ ان میں سے ایک تو بمقام دولت آباد سنہ 1117ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور دوسرا سنہ 1177ھ کا۔ یہ دونوں نسخے صاف لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد دو اور نسخے ملے جو ایسے اچھے نہیں اور ایک ان میں سے ناقص ہے''۔(۱۹)

مولوی عبدالحق نے اپنی مرتبہ تصنیف ''سب رس'' کے مقدمے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ''سب رس'' کی ترتیب میں چار نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔ایک نسخہ دولت آباد 1117ھ کا،دوسرا حیدرآباد 1177ھ کا اور دو نسخے ناقص تھے۔مگر مولوی عبدالحق نے اکٹوبر 1924ء مضمون ''اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب'' میں دولت آباد کے نسخے کی سنہ تصنیف 1171ھ لکھا ہے اور اپنی مرتبہ تصنیف ''سب رس'' میں دولت آباد کے نسخے کا سنہ 1117ھ لکھا ہے۔جبکہ دولت آباد کے نسخے کی سنہ تصنیف 1171ھ ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''الحمداللہ کہ نسخۂ ''سب رس'' پچیسویں جمادی الاول سنہ 1171ھ/ ۱۱۷۱ھ روز اتوار در قلعہ مبارک دولت آباد تمام ہوئی۔ تصنیف میاں وجہی قدس سرہٗ''۔(۲۰)

دولت آباد کے نسخے کی سنہ تصنیف 1117ھ نہیں بلکہ 1171ھ ہے۔یہ کتابت کی غلطی بھی نہیں ہوسکتی کیوں کہ مولوی عبدالحق نئے ''سب رس'' کو 1953ء میں دوبارہ اپنی نظر ثانی کے بعد شائع کیا تھا۔اس میں بھی دولت آباد کے نسخے کی سنہ تصنیف 1117ھ ہی لکھی ہوئی ہے۔جبکہ دولت آباد کے نسخے کی سنہ تصنیف 1117ھ نہیں بلکہ 1171ھ ہے۔کیوں کہ افسر صدیقی امروہوی نے اپنی مرتبہ تصنیف ''مخطوطات انجمن ترقی اُردو'' میں دونوں نسخوں کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سائز 5x8،صفحات 230،سطور 15،سنہ تصنیف 1045، سنہ کتابت 1171ھ''۔

الحمداللہ کہ نسخہ سب رس پچیسویں جمادی الاول 1171ھ روز اتوار قلعہ مبارک دولت آباد تمام ہوئی تصنیف میاں وجہی قدس سرہٗ بخط فقیر پر تقصیر محمد واصل جیلانی بجہتہ یادگارے نوشہ شد۔ ہروقت......(۲۱)

''سائز ½4،صفحات 277،سطور 17،سنہ تصنیف 1045ھ، سنہ کتابت 1177ھ،ختم الکتاب چہاردہم شہر رجب المرجب 1177ھ یوم چہار شنبہ،سب رس کا اختتام صفحہ 275 پر ہوگیا ہے''۔......(۲۲)

مولوی عبدالحق نے ''سب رس'' کو چار نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا ہے۔ مگر نہ تو مقدمے میں ان نسخوں کی کوئی کیفیت موجود ہے اور نہ ہی کسی نسخے کو بنیادی نسخہ قرار دیا ہے کیوں کہ ترتیبِ متن میں مدون کو چاہئے کہ وہ تمام نسخوں پر تفصیل سے روشنی ڈالئے اور کسی ایک بنیادی نسخے کو بنیادی نسخہ قرار دیئے تا کہ اختلاف نسخ درج کرنے میں کوئی اُلجھن نہ ہو۔ مولوی عبدالحق نے اختلاف نسخ درج کرنے میں تین نشانات کا استعمال کئے ہیں۔

ا۔☆ن

۲۔☆☆ن

۳۔☆☆☆ن

مگر ان نشانات سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ کونسا نشان کس نسخے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق کے اختلاف نسخ کے طریقہ کار اور اُن کی لاپرواہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حمیرہ جلیلی لکھتی ہیں:

> ''مولوی عبدالحق نے اختلافات کے ساتھ تین نشانات استعمال کئے ہیں۔......(ن)......ن۔ ان نشانات سے ممکن ہے کہ مختلف نسخوں کے اختلافات کو واضح کرنا ہو۔ لیکن مقدمے میں نہ تو ان نسخوں کی کیفیت لکھی ہے اور نہ ہی ان کا کچھ اتہ پتہ بتایا ہے۔ مندرجہ صدر دو جملوں میں صرف یہ بتایا ہے کہ دو نسخوں میں ایسا لکھا ہے۔ حالانکہ سب رس کے ہر نسخے کا دوسرے نسخے سے مقابلہ کیا جائے تو اختلافات کی تعداد سینکڑوں تک پہونچتی ہے''۔(۲۳)

آگے لکھتی ہیں:

> ''مولوی عبدالحق نے 1953ء میں سب رس کو دوبارہ کراچی سے شائع کیا اور فٹ نوٹس میں بائیس (۲۲) زائد اختلافات درج کئے۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ سب رس کی دوبارہ اشاعت کے وقت مولوی عبدالحق نے بعض نئے نسخوں سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن دیباچہ

میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔اس کے علاوہ 1932ء اور 1953ء کے
مطبوعہ نسخوں کے مقابلے سے جو اختلافات سامنے آئے ہیں ان کی بھی
کوئی نشاندہی نہیں کی گئی ہے''۔(۲۴)

مولوی عبدالحق نے جہاں اختلاف نسخ درج کرنے میں لاپرواہی دکھائی ہے۔ وہیں کئی باتوں کو بنا حوالے لکھ دیئے ہیں۔ مقدمہ ترتیبِ متن میں 'دل' کی اہمیت رکھتا ہے۔ مدون کو ہر بات صرف اور صرف مقدمے میں ہی کہنا ہوتا ہے۔ مدون کوئی بھی بات یوں ہی نہیں کرسکتا۔ یہ ترتیبِ متن کا سب سے پہلا اُصول ہوتا ہے۔مگر مولوی عبدالحق ''سب رس'' کے مقدمے میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلیات اور محمد قطب شاہ کے دیوان کا ذکر تو کیا ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا۔ لکھتے ہیں:

''سلطان محمد قلی قطب شاہ (سنہ 988ھ تا سنہ 1020ھ) کا
ضخیم کلیات اس کی قادر الکلامی اور وسیع النظری پر دلالت کرتا ہے۔
اُردو میں اس سے قبل کا ایسا پاکیزہ کلام دریافت نہیں ہوا ہے۔اس کا
بھتیجا اور جانشین محمد قطب شاہ (سنہ 1020ھ تا 1035ھ) بھی اُردو کا
بہت اچھا شاعر ہوا ہے اور اس کا دیوان موجود ہے''۔(۲۵)

مولوی عبدالحق نے اکٹوبر 1924ء رسالہ اُردو میں مضمون ''اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب'' میں ''سب رس'' کا تعارف کروایا۔مگر محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کے کلیات اور دیوان کا ذکر نہیں کیا۔اس اقتباس کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے۔مولوی عبدالحق نے سید محی الدین قادری زور کی تصنیف ''اُردو شہ پارے'' سے استفادہ کیا ہو۔ کیوں کہ سید محی الدین قادری زور نے محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کا ذکر اپنی تصنیف ''اُردو شہ پارے'' کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُس نے اپنے چچا کے پیدا کئے ہوئے امن وامان اور ادبی
ذوق سے بھی بے حد استفادہ کیا اور اُن تمام شاعروں اور ادیبوں کی جو
دربار حیدرآباد سے تعلق رکھتے تھے، سرپرستی کی وہ خود ایک اچھا شاعر تھا
اور دو دیوان چھوڑے ہیں جن میں سے ایک دکنی زبان میں اور دوسرا

زبان فارسی میں ہے۔ یہ دونوں دیوان نواب سالار جنگ بہادر کے
کتب خانہ میں محفوظ ہیں''۔(۲۶)

''سب رس'' کا سب سے اہم نکتہ اُس کا ماخذ ہے۔

مولوی عبدالحق پہلے محقق ہیں جنھوں نے رسالہ اُردو اکتوبر 1924ء میں (جلد چہارم) میں مضمون اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب میں اِس کتاب کا تعارف کروایا۔ مگر ''سب رس'' کے ماخذ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کیوں کہ اُس وقت فتاحی کی مثنوی ''دستور عشاق'' نہیں گزری تھی۔ 1926ء میں ''دستور عشاق'' کی ترتیب و تدوین کر کے آر۔ ایس گرین شیلڈرس نے جب اسے برلن سے شائع کرایا تو اس کے بعد مولوی عبدالحق نے 1932ء میں ''سب رس'' کو اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو ہند (اورنگ آباد) سے شائع کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر حمیرہ جلیلی نے 1983ء میں سب رس کا تنقیدی تدوین، ڈاکٹر منظر اعظمی نے 1984ء میں ''سب رس کا تنقیدی جائزہ''، اور شمیم انہونوی نے 1985ء میں ''سب رس'' (قصہ حسن و دل) کے نام سے شائع کیا۔

مولوی عبدالحق ''سب رس'' کے مقدمے میں ماخذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وجہی نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا کہ یہ قصہ اسے کہاں سے ملا، دیباچے پڑھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اُسی کی ایجاد ہے۔ اور اُسی کے دماغ کی اُپج ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ پُرلطف داستان سب سے پہلے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری نے لکھی۔ ملا وجہی نے قصّے کی اصل کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا۔ مگر دونوں کتابوں کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وجہی نے قصّے کی واردات حرف بحرف فتاحی سے لی ہے۔ اپنی طرف سے کوئی اضافہ کیا ہے تو یہ کہ جا بجا موقع بے موقع پند و موعظت کا دفتر کھول دیا ہے جس کا اصل کتاب میں نام و نشان نہیں''۔(۲۷)

اور آگے مولوی عبدالحق نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا قیاس یہ ہے کہ وجہی کو فتاحی کی حسن و دل جو نثر میں ہے

ہاتھ لگ گئی تھی۔ ''دستور عشاق'' اس کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ وجہی نے اپنی نثر میں اُسی کا طرز اُڑایا ہے اور مسجع اور مقفیٰ عبارت لکھی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جن اُمور کا ذکر ''دستور عشاق'' میں مفصل ہے اور نثر کے خلاصے میں سرسری یا برائے نام ہے اُن کی تفصیل وجہی کے ہاں بھی نہیں پائی جاتی''۔(۲۸)

دکنی کے کئی محققین مولوی عبدالحق کی اسی رائے سے متفق ہیں کہ وجہی نے اپنی تصنیف ''سب رس'' میں کہیں بھی اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ وجہی کو فتاحی کی ''حسن و دل'' جو مثنوی ''دستور عشاق'' کا خلاصہ ہاتھ لگ گیا۔ وجہی نے مثنوی ''دستور عشاق'' سے استفادہ نہیں کیا۔ مگر عزیز احمد کا خیال ہے کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ وجہی کی ''سب رس'' کے دستور عشاق سے ماخوذ اور بڑی حد تک اس کا آزاد ترجمہ ہے''۔(۲۹)

ڈاکٹر حمیرہ جلیلی نے اپنی تصنیف سب رس کی تنقیدی تدوین اور منظر اعظمی نے اپنی تصنیف ''سب رس کا تنقیدی جائزہ'' میں ''سب رس'' کا ماخذ فتاحی کا قصہ ''حسن و دل'' کو قرار دیا ہے۔ حمیرہ جلیلی لکھتی ہیں:

''دستور عشاق ''قصہ حسن و دل'' اور ''سب رس'' کے تقابلی مطالعہ سے قیاس ہوتا ہے کہ وجہی کے پیش نظر شاید قصّہ حسن و دل ہی تھی کیوں کہ جن اُمور کا ذکر دستور العشاق میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ وہ ''حسن و دل'' میں برائے نام ہیں یا ہیں ہی نہیں۔ سب رس میں بھی ایسا ہی ہے''۔(۳۰)

مگر گیان چند جین ''سب رس'' کا ماخذ مثنوی ''دستور عشاق''، قصہ ''حسن و دل'' کے بجائے شبستانِ خیال سمجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اس بحث میں کسی نے شبستانِ خیال کا ذکر نہیں کیا۔ ظاہراً یہ کتاب عبدالحق سے لے کر جاوید وشست تک کسی کی نظر سے نہیں

گزری۔ کون جانے کہ وجہی نے شبستانِ خیال سے بھی استفادہ کیا
ہو''۔(۳۱)

دراصل فتاحی نے پہلے مثنوی ''دستورعشاق'' (فارسی)840ھ 1436ء لکھی۔اس کے بعد فتاحی نے اسی قصّے کو نثر کا جامعہ پہنا کر قصہ ''حسن ودل'' اور شبستانِ خیال (843ھ 1439ء) لکھا۔دکنی کے ہر محقق نے یہی دعویٰ کیا ہے کہ وجہی نے ''سب رس'' میں کہیں بھی اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا اور وہ اُسی کے دماغ کی اُپج ہے۔مگر راقمۃ الحروف اس بات سے اتفاق نہیں رکھتی کہ وجہی نے سب رس میں کہیں بھی اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا کیوں کہ وجہی نے ''سب رس'' کے ابتداء ہی میں کتاب کا نام اور اپنے ماخذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اس کتاب کا ناؤں ''سب رس'' سب کو پڑھنے آوے ہوس۔ بول بول کوں چڑھے اُسی ، یادگار رہوا چھیگا دنیا میں کئی لاکھ برس۔ بہوت لذیذ، عاشقاں کے گلے کا تعویذ، یو کتاب سب کتاباں کا سرتاج ،سب باتاں کا راج، ہر بات میں سوسو معراج، اس کا سواد سمجھے نا کوئی عاشق باج،اس کتاب کی لذت پائے عالم سب محتاج''۔(۳۲)

اور آگے وجہی اپنے ماخذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''جیتے چوساراں، جیتے فہم داراں، جیتے گن کاراں، ہوئے سن آج لگن، کوئی اس جہاں میں، ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں، نظم ہورنثر ملا کر گلا کریوں نیں بولیا۔اس بات کوں اس نبات کوں یوں کوئی آب حیات میں نیں گھولیا، یوں غیب کا علم نہیں کھولیا''۔(۳۳)

وجہی نے 1045ھ 1635ء میں ''سب رس'' لکھی۔اُس وقت مثنوی ''دستورعشاق''، ''قصہ حسن و دل'' اور شبستانِ خیال منظر عام پر آ چکی تھی اور وجہی کے سامنے یہ تینوں کتابیں موجود تھی جس کا ذکر وجہی نے کھلے الفاظ میں کیا ہے۔''سوں نظم ہور نثر ملا کر گلا (کلا) کر یوں نہیں بولیا''۔(......) نظم اور نثر یعنی (مثنوی ''دستور

عشاق'' اور قصہ حسن و دل کو گلا کرنہیں بلکہ ''کلا کر'' (مولوی عبدالحق دکنی کے کئی الفاظ کا تلفظ سمجھنے میں غلطی کر جاتے تھے)۔ یعنی دو چیزوں کو ملا کر ایک کرنا جیسے مٹی اور پانی کو ملا کر کیچڑ بنانا، اور وجہی نے بھی سب رس میں یہی کیا ہے۔ ہاں کتاب کی ضخامت بڑھانے کی غرض سے پند و نصیحت کا دفتر کھول دیا ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''غرض بہوت نادر نادر باتاں بولیا ہوں، دریا ہوکر موتیاں رولیاں ہوں، موتیاں کی موجاں کا میں دریا ہوں، تمام موتیاں سوں بھریا ہوں، اس دریا میں غوطہ کھائیں گے، تو جاگا جاگا کے غواصاں موتیاں پائیں گے۔ یو کتاب عجائب ایک بندر ہے، اگر سورج منگتا و گر چندر ہے۔ فریاد ہوکر، دونوں جہاں نے آزاد ہوکر، دانش کے تیشے سوں پہاڑاں الٹایا، تو یو شیریں پایا۔ تو یو نوی بات پیدا ہوئی''۔ (۳۴)

مولوی عبدالحق کی تحقیق کو بنیاد بنا کر عزیز احمد، منظر اعظمی، جاوید وششٹ، گیان چند جین اور حمیرہ جلیلی نے چراغ سے چراغ جلائے۔ کوئی بھی محقق وجہی کی کہی ہوئی باتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں وجہی نے پوری ''سب رس'' میں کہیں بھی فتاحی کی مثنوی ''دستور عشاق'' اور قصہ ''حسن و دل'' کا ذکر کھلے الفاظ میں نہیں کیا۔ اُس نے اشاروں اور کنایوں میں اپنی بات کہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اُس زمانے میں فتاحی کی مثنوی ''دستور عشاق'' اور قصہ ''حسن و دل'' اس قدر مشہور ہو گیا تھا کہ کئی ادیبوں نے بھی اس قصہ کو اپنے اپنے طور پر لکھا۔ اس لئے وجہی نے بھی اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ اُس کو وجہی کی غلطی کہیے یا نادانی۔

مثنوی ''دستور عشاق'' اور قصہ ''حسن و دل'' سے متاثر ہوکر اِس قصہ کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا جس میں ترکی، فارسی، مراٹھی، ہندی اور دکھنی (اُردو) وغیرہ شامل ہیں۔ جس کی فہرست منظر اعظمی نے اپنی تصنیف ''سب رس کا تنقیدی جائزہ'' میں دی ہے۔

مراٹھی

-1	مادھو سوامی	''پربودھا چندرودلے کا ویئے''	1703ء
-2	نے ولڑکر	''منوجے''	1908ء (ڈرامہ)

ترکی

1-	آہی..................	1517ءف	(نثر)
2-	لامعی..................	1531ء	(نثر)
3-	والی..................	16ویں صدی کا آخر	(نظم)

فارسی (ایران)

1-	فتاحی	''دستورعشاق''	1436ھ(نظم)
2-	فتاحی	''حسن ودل''	1436ھ(نثر)
3-	فتاحی	''شبستانِ خیال''	1439ء(نظم)

فارسی (ہند)

1-	حرفی..................	1585ء	(نظم)
2-	داؤد املی ''حسن ودل''	1644ء	(نظم)
3-	بےخود قصہ ''حسن ودل''	1682ء	(نظم)
4-	بیدل قصہ ''حسن ودل''	1685ء	(نثر)
5-	عالی ''مضحکات حسن ودل''	1709ء	-
6-	والٓی ''پر بودھ چندرودے''	-	(نثر)

دکھنی اُردو

1-	ملاوجہی	''سب رس''	1635ء(نثر)
2-	ذوقی	''وصال العاشقین''	1697ء(نظم)
3-	مجرمی	''گلشن حسن ودل''	1702ء(نظم)
4-	قادری	''سب رس'' منظوم	1745ء(نظم)
5-	خاتم دکھنی	''حسن ودل''	1737ء1150ھ (نظم)

-6	عطائی	''رسالہ دل پسند''	................(نظم)

شمالی اُردو

-1	حکیم میر علی خاں	''جان جہاں''	1844ء1291ھ (نظم)
-2	خیر الدین خواجہ	''حسن و دل''	1847ء1264ھ (نظم)
-3	منشی غلام شاہ بھیک	''قصّہ حسن و دل''	1801ء(نثر)

انگریزی

-1	آرتھر براؤن	....	1801ء
-2	ولیم پرائس	....	1821ء
-3	آر۔ایس گرین شیلڈس	''دستور عشاق''	(ترتیب واشاعت مع مقدمہ)1926ء(۳۵)

مولوی عبدالحق نے ''سب رس'' کے مقدمے میں چار ترکی شاعروں کا ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''ترکی شاعری معی (سنہ وفات 938ھ یا 1531ء) کی داستان سے بھی جس نے اپنی زبان میں لکھا ہے۔اِس قصّے کا مقابلہ کیا۔تین اور ترکی شاعروں نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ایک تو آھی (سنہ وفات 1517ء) اور دوسرا ''والی'' ہے جو سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوا اور تیسرا ''صدقی''۔لامعی اور آھی کی کتابیں نثر میں ہیں۔والی اور صدقی کی نظم میں''(۳۶)

مولوی عبدالحق نے ''سب رس'' کے مقدمے میں چار ترکی شاعروں لامعی، آھی، والی اور صدقی کا صرف ذکر کیا ہے اور اُن کی حالاتِ زندگی کی کوئی تفصیل مقدمے میں نہیں ملتی۔وہی ہندوستان کے دو شاعر محمد

بیدل اور داؤد املحی کا ذکر بھی مقدمے میں ملتا ہے۔لیکن مولوی عبدالحق نے داؤد ملحی کو داؤد ایلچی لکھا ہے۔

> ''ہندوستان بھی اس سے خالی نہیں۔ عہد عالمگیر میں سنہ 1095ھ میں خواجہ محمد بیدل نے اس قصّے کو پُر تکلف نثر میں لکھا ہے ......لیکن ہندوستان میں ''حسن ودل'' کے نام سے اسی قصّے کو ایک شاعر نے بھی نظم کیا ہے جس کا ذکر یوروپین مترجموں نے نہیں کیا۔اس کے مصنف داؤد ایلچی ہیں جنھوں نے اپنی مثنوی ''حسن ودل'' سنہ 1054ھ میں نظم کی''۔(۳۷)

مولوی عبدالحق نے داؤد املی کا نام داؤد ایلچی لکھا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی نہیں ہوسکتی۔اس کی نشاندہی سب سے پہلے نورالسعید اختر نے اپنے مضمون ''قصہ حسن ودل مختلف زبانوں'' میں کی ہے۔اس کے بعد منظر اعظمی نے نورالسعید اختر کے حوالے سے اور حال ہی کی تحقیق میں حمیرہ جلیلی نے اپنی تصنیف ''سب کی تنقیدی تدوین'' میں داؤد املحی کا مختصر تعارف پیش کیا ہے، لکھتی ہیں:

> ''داؤد املحی نے 26 شعبان 1054ھ (18 اکتوبر 1644ء) میں ''قصہ حسن ودل'' کو نظم کیا۔اسی کا ایک بہترین نسخہ کتب خانہ جامعہ بمبئی میں موجود ہے۔کتابت کی غلطی کی بنا پر ایک عرصہ تک ان کا تخلص ایلچی سمجھا جاتا رہا ہے۔ مذکورہ نسخے کی کتابت خود املحی نے کی ہے جس کے متن میں کئی بار انھوں نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا تخلص ایلچی نہیں بلکہ املحی ہی ہے''۔(۳۸)

(مرتبہ سب رس کا خلاصہ)

مضمون ''اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب'' میں کا خلاصہ

1- ایک طرف عقل اور عشق کا معرکہ ہے اور دوسری طرف دل اور حسن کا۔ عقل مغرب کا بادشاہ اور عشق مشرق کا۔ عقل کا ملک 'یونان' (بقول وجہی سیتان) تھا۔ حسن عشق کی بیٹی ہے اور دل عقل کا فرزند ہے۔ بیٹا جب سیانا ہوا تو باپ (عقل) اُسے شہر تن (بدن) کا والی بنا دیتا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ دل کا ایک مصاحب آبِ حیات کا قصّہ پڑھ کر سنایا ہے۔ (۱۲)

نقل ہے کہ ایک شہر تھا جس کا نام تھا سیستان۔ وہاں کا ایک بادشاہ تھا جس کا نام عقل تھا۔ عقل کا ایک بیٹا تھا دل نام۔ جو شراب بہت پیتا تھا۔ ایک روز عالم مستی میں ایک ندیم نے آبِ حیات کا قصہ پڑھ کر سنایا۔ (۳)

2- دل کو آبِ حیات کا ذکر سنکر اس کے حاصل کرنے کی دھن لگتی ہے اور اُس کے پیچھے ایسا دیوانہ ہوتا ہے کہ کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ آخر اُس کا جاسوس نظر اس کی تلاش میں نکلتا ہے۔ (۱۳)

اس کی تعریف کے پُل باندھ دیئے کہ جو کوئی اسے ایک دفعہ بھی پی لے گا تو موت سے نجات پائے گا اور خضر کی طرح ہمیشہ زندہ و سلامت رہے گا۔ شہزادۂ دل کو اس کا اشتیاق پیدا ہوا اور یہ دھن سمائی کہ جس طرح ہو اسے حاصل کیجئے۔ بغیر آب حیات کے زندگی عبث ہے۔ دن رات اُسی فکر میں رہنے لگا۔ دل کی بے قراری بڑھنے لگی اور عشق کی سی کیفیت ہونے لگی۔

اِس حال سے مصاحب، مشیر، دوست، آشنا، راجا، پرجا سب حیران پریشان تھے۔ اور کوئی تدبیر بن نہ آئی۔ شاہزادے کا ایک جاسوس تھا نظر نام۔ وہ ہر مقام پر پہنچتا اور جگہ جگہ کی خبر رکھتا تھا۔ بہت ہوشمند اور صاحبِ فراست تھا اور ہر کام کے کرنے میں مستعد۔ جہاں کوئی نہ جاسکے وہاں وہ وہ جائے۔ جو کام کوئی دوسرا نہ کر سکے وہ کر کے لائے۔ وہ حضوری میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضور مایوس نہ ہوں۔ یہ جان نثار ہے اور آبِ حیات کی خبر لانا ہے۔ شہزادہ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس کی محبت اور اخلاص کی تعریف کی، گلے لگایا اور خوشی خوشی اجازت دی۔ (۴،۳)

3- رستے میں اُسے ایک خوش منظر اور خوش حال شہر ملتا ہے جس کا نام عاقبت اور اس کے بادشاہ کا ناموس ہے وہ ناموس سے ملاقات کرنا ہے اور اپنے سفر کا مقصد بیان کر کے رہنمائی کا طالب ہونا ہے۔ ناموس کہتا ہے کہ آبِ حیات کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ فسانہ ہے اصل آب حیات انسان کی آبرو ہے۔ نظر مایوس ہو کر آگے بڑھتا ہے۔(۱۳)

شہر کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسے عاقبت کہتے ہیں اور یہاں کے بادشاہ کا نام ناموس ہے۔ لیکن دل میں یہ گدا تھی کہ جس کام کے لئے اس نے کھکھیڑ اٹھائی ہے وہ کیونکر پورا ہو۔ آخر سوچتے سوچتے وہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اس کی طرز وروش کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اپنے پاس بٹھایا اور احوال پوچھا اوّل اوّل اسے دلی مقصد بیان کرنے حجاب معلوم ہوا۔ آخر شرکو بالائے طاق رکھ کر منہ پھوڑ کر بولا کہ جہاں پناہ! میں آبِ حیات کی تلاش میں گھر سے نکلا ہوں۔ یہاں تک آیا ہوں شاید اُمید برآئے۔ اس کے بعد بادشاہ کو سلام کر کے رخصت ہوا۔ لیکن بہت ملول اور رنجیدہ تھا اور کوئی تدبیر سوجھ نہیں پڑی تھی۔ لیکن خود اسے اُمید تھی کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔(۴)

4- چلتے چلتے ایک عظیم الشان پہار کے قریب پہنچتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام زہد ہے اور ایک بڈھے زرق نامی کا آشیانہ ہے۔اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔آبِ حیات کا نشان پوچھا۔اس نے کہا کہ آبِ حیات دنیا میں کہاں وہ تو بہشت میں ہے۔ ہاں اگر اس کی تلاش ہے تو عاشقوں کے آنسوؤں میں ڈھونڈھ۔

اتنے میں ایک پہاڑ دیکھا جو بہت بلند تھا اُس کے پاس گیا اور وہاں لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا جگہ ہے اور یہاں کون رہتا ہے۔جوان ملا کہ یہ پہاڑ زہد ورزق کا مقام ہے۔وہاں جانا بہت کٹھن ہے۔ وہاں ایک بڈھا رہتا ہے جو بہت بزرگ اور اللہ والا ہے۔ اس کا نام رزق ہے ۔غرض وہ اُس پہاڑ پر چڑھا اور رزق کے پاس پہنچ کر سلام علیکم ہے۔اس نے سلام کا جواب دیا۔رزق نے پوچھا تم یہاں کیسے آئے اور کس نے تمہیں یہ رستہ دکھایا اور تمہارا کیا نام ہے۔نظر نے اپنا مطلب بیان کیا اور آبِ حیات کی تلاش کا قصّہ کہا۔رزق نے فرمایا کہ آبِ حیات جس کی تلاش میں ہے نہ کسی باغ میں ہے نہ کسی کشت زار میں۔البتہ یہ سنا ہے کہ بہت میں ہے۔ اسے تم یہاں کہاں پاؤگے۔(۴)

5- (نظر) وہاں سے مایوس ہوکر آگے چلا تو ہدایت نام ایک سر بفلک کوٹ دیکھا جس کا بادشاہ ہمت تھا۔ اس نے البتہ کچھ ہمت بندھائی اور آبِ حیات کا پتہ بتایا اور کہا کہ کوہ قاف کے اُس طرف ایک شیر ہے جس کا نام دیدار ہے۔ اُس میں ایک باغ ہے۔ جس کا نام رخسار ہے اور اس باغ میں ایک چشمہ دھن ہے اور اسی چشمے میں آبِ حیات ہے جس کی تجھے تلاش ہے۔ (۱۳)

وہاں سے بھی مایوس ہوکر چلا۔ چلتے چلتے جنگل میں ایک کوٹ دیکھا جو سر بفلک تھا اور مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کوٹ کے پاس جا کر لوگوں سے پوچھا کہ اس کوٹ کا کیا نام ہے اور یہاں کا بادشاہ کون اور کیسا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ اس کوٹ کا نام ہدایت اور بادشاہ کا نام ہمت ہے۔ یہ سن کر اسے کسی قدر ڈھارس ہوئی کہ بارے ہمت کے پاس تو پہنچ گیا۔ شاید یہاں مراد برآئے۔ ہمت کے پاس پہنچ کر عرض کیا کہ آپ صاحبِ دولت، صاحبِ نصرت اور بادشاہِ مملکت ہیں۔ آپ کا نام ہمت ہے۔ میرا مقصد بر لائیں اور مجھے میرے مطلوب تک پہنچائیں۔ ہمت اسے خلوت میں لے گیا۔ بہت کچھ تسلی دلاسا دیا اور سارا حال سن کر کہا کہ تو ثابت قدم اور باوفا شخص ہے جو میں کہوں سنا اور میری بات گرہ میں باندھ۔ شاید اپنا مقصد پائے۔ مشرق میں ایک ولایت ہے۔ وہاں کے بادشاہ کا نام عشق ہے۔ ہر دل میں اس کا گھر ہے۔ سب سے اس کا اتفاق ہے اور کسی سے بگاڑ نہیں۔ لیکن وہ نہایت بے پروا اور سرمست ہے۔ وہ ایک آگ ہے جو بجھ نہیں سکتی اور ایک پھانس ہے جو نکل نہیں سکتی۔ اس بادشاہ کی ایک بیٹی ہے۔ بہت خوش رنگ، بہت خوش ڈھنگ جندے آفتاب، جندے مہتاب، جس کے عشق میں ہزاروں

محبتوں وفریاد ہیں۔کوہ قاف ادھرایک شہر ہے اوراس شہر میں ایک باغ ہے جو تر وتازگی اور شادابی میں رشک بہشت ہے۔ شہر کا نام دیدار اور باغ کا نام رخسار ہے۔ باغ میں ایک چشمہ ہے جس کا نام جگ جیون ہے۔ پانی اس کا مصری سے میٹھا ہے۔اسی چشمے سے تجھے آبِ حیات ملے گا اور وہیں تو اپنا مقصد پائے گا اور عشق کی نازنین بیٹی حسن بہت ناز و انداز سے چاندسی سہلیوں کے ساتھ یہاں سیر کرتی اوراس چشمے سے پانی پیتی ہے۔(۵)

رقیب روپیہ کا بہت لالچی تھا۔ یہ سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔اوراس کی ملاقات کو بہت غنیمت سمجھا۔طمع نے فولاد کو موم کر دیا اور نظر سے سونا بنانے کی فرمائش کی۔نظر نے جواب دیا کہ اس کے لئے چند دواؤں کی ضرورت ہے۔شہر دیداراور گلشن رخسار یہاں سے قریب ہے وہاں ہم تم مل کر چلیں گےاور دوائیں تلاش کریں گے۔ خدا نے چاہا تو سب کام ٹھیک ہوجائے گا۔رقیب لالچ کا مارااس کے جھانسے میں آگیا۔ دونوں مل کر شہر دیدار کی طرف چلے۔(٦)

6- رقیب کو لالچ نے گھیرااور سونے کی طمع میں اسے بڑی خاطر سے اپنے پاس رکھا۔ جب سونا بنانے کی فرمائش کی تو نظر نے کہا بعض دوائیں صرف شہر دیدار میں ملتی ہیں وہاں لے چلوتو سونا بنادوں گا۔(۱۳،۱۴)

7- وہاں گیا تو قامت ہوئی۔ ہمت کا خط دیا اور اس کی مدد سے چھپ کر رقیب کے پنجے سے رہائی پائی اور شہر دیدار کا قصد کیا۔ رخسار کے گلزار میں پہنچا تو دل باغ باغ ہوگیا۔

غرض دونوں اُس شہر میں پہنچے خامت نے جو نظر کو رقیب کے ساتھ دیکھا تو چھپ کر اُس کا دل پوچھا۔ نظر نے ہمت کا رقعہ قامت کو دیا۔ قامت مضمون خط پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ قامت کا ایک غلام تھا۔ سیم ساق اسے حکم دیا کہ جس طرح ہو سکے نظر کو آنکھ بچا کر ایک طرف لے جا کر کہیں چھپا دے۔(٦)

سیم ساق نے اسے فرش فرح بخش کے آسرے میں چھپا دیا۔ رقیب نے جب دیکھا کہ نظر غائب ہوگیا تو بہت جھلایا۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ کہیں نہ پایا تو اپنی حماقت پر بہت افسوس کیا اور پریشان ہوکر اپنے شہر واپس چلا آیا۔ نصیب جب دفع ہوا تو نظر قامت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ بہت بہت دعائیں دیں۔ پھر کہا کہ مجھے شہر دیدار کی دھن لگی ہوئی ہے۔ زیادہ ٹھیر نہیں سکتا۔ اجازت دیجئے قامت نے بخوشی اجازت دی۔(٦)

8- زلف سے وداع ہو کر پھر شہر دیدار کی طرف چلا اور تھوڑی دیر میں رخسار کے گلزار میں پہنچ گیا۔ وہاں کا نگہبام غمزہ تھا۔ غمزہ نظر کا بھائی تھا۔ لیکن بچپن میں جدا ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تھے۔ غمزے نے جو غیر شخص کو گلزار میں دیکھا تو فوراً جھپٹ کر اُسے گرفتار کر لیا اور قتل ہی کرنا چاہتا تھا کہ اس کی نظر بازوبند پر پڑی۔ ان کی ماں نے بچپنے میں نشان کے لئے دونوں کے بازوں پر ایک ایک لعل باندھ دیا تھا۔ دیکھتے ہی وہ نظر سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔ دونوں بھائی ملے نظر نے اپنا سب احوال سنایا۔ غمزہ حسن کا مصاحب تھا وہ اسے حسن کے پاس لے گیا۔ حسن کے پاس ایک نہایت خوش رنگ بیش بہا لعل تھا جس پر ایک خوبصورت موہنی مورت بنی ہوئی تھی۔ اس نے پرکھنے کے لئے نظر کو دکھایا وہ دیکھ کر حیران ہو گیا اور کہا کہ یہ صورت تو دل کی ہے۔

لٹ سے وداع ہو کر نظر نے شہر دیدار کی طرف چلنے کا قصد کیا اور تھوڑی دیر میں رخسار گلزار کے ایک مقام پر پہنچا اور وہاں راحت و آرام پایا۔ اتنے میں اس نے کچھ حبشی بچے دیکھے اور انھوں نے اسے دیکھا۔ نظر نے پوچھا تم کون ہو۔ کیا نام ہے اور کیا کام کرتیکرتے ہو؟ جواب دیا کہ حسن نازنین نے حبش سے ایک تل (لونڈی) بلائی تھی۔ تل بڑی ساحرہ ہے اور عاشقوں پر اس کا بہت ظلم ہے۔ ہم سب اسی کے غلام ہیں اور اس باغ کی نگہبانی کرتے ہیں۔

چمن چمن میں پانی دیتے پھرت ہیں۔ یہاں کے سب پھول پھل ہماری نگرانی میں ہیں۔ (٦-٧)

(اس کا ذکر مرتبہ ''سب رس'' کے خلاصے میں نہیں ہے)

حسن کو بھی اس کی اطلاع ملی کہ غمزہ کا بھائی جو بچپن سے بچھڑا ہوا تھا۔ آملا ہے۔ اس نے غمزہ کو بلا کر اس کے بھائی کا احوال پوچھا ج کہ تیرے بھائی کا کیا نام ہے اور کیا کام کرتا ہے؟ غمزہ نے کہا کہ میرے بھائی کا نام نظر ہے اور بہت کامل آدمی ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا ہنر جانتا

ہے۔ اس نے کہا کہ جواہرات خوب پرکھتا ہے۔حسن کے پاس ایک عجیب وغریب جواہر تھا جس کی جوت سے سارا مکان روشن ہوجاتا۔ کہنے لگی کہ بہت دنوں سے اس سوچ میں تھی کہ کوئی جوہر شناس آئے تو اسے دکھاؤں۔ بارے الحمداللہ ایسا جوہر شناس آدمی آ گیا۔ یہ سن کر غمزہ دوسرے روز نظر کو ساتھ لایا اور حسن کے حضور میں حاضر کر دیا۔حسن کو نظر کی روش بہت بھائی۔نظر نے سلام کیا۔ حسن نے جواب دیا۔خزانہ دار کو بلایا اور اس لعل خوش رنگ کے حاضر کرنے کا حکم دیا۔ وہ دوڑا ہوا گیا۔اور ترت لے کر آیا۔نظر نے جو اسے دیکھا تو عقل دنگ رہ گئی۔(۷)

8- یہ سنتے ہی حسن دل پر عاشق ہوجاتی ہے۔نظر نے کہا کہ دل کو آبِ حیات کی بڑی جستجو ہے اور اس کے پیچھے دیوانہ ہورہا ہے۔ یہ تمہاری ہاتھ میں ہے۔ یہ مل جائے تو دل کو تیرے پاس لے آتا ہوں۔

اس جوہر میں جو بات تھی کہہ سنائی اور عرض کیا کہ یہ پاک صورت یہاں کیونکر آئی۔اس صورت کا نام دل ہے پھر سارا احوال کہہ سنایا اور ان کی باتیں کھول کر بیان کر دیں۔ یہ حالات سن کر حسن کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ دل پر جان سے فریفتہ ہوگئی اور عشق کا جادو چل گیا۔(۸۔۷)

-9 اب نظر حسن کا بھی راز دار ہو گیا۔ کہنے لگی کہ
جسے تو نے مجھے دل پر عاشق کیا ہے۔ اب اس
کے ملنے کی بھی فکر کر۔ نظر نے کہا دل کا ساتھ
آنا بہت مشکل ہے۔ وہ اپنے جی کا مالک ہے
کسی کا اُس پر بس نہیں چلتا۔ دل اسی سے ملتا
ہے جو دل ملانا جانتا ہے۔ جو دل سے دل ملانا
جانتا ہے وہی دل کو پاتا ہے۔ تو نے جو دل
سے دل لگایا ہے تو تجھے بھی زیبا ہے۔ دل کو بھی
حسن بہت بھاتا ہے۔ لیکن دل کو تیرے پاس
لانا آسان نہیں۔ خون جگر کھانا ہے۔ ایک
بادشاہی میں خلل ڈالنا ہے۔ اس میں جان کا
خطرہ ہے۔ عقل بادشاہ جو دل کا باپ ہے اس
نے اسے تن کوٹ میں قید کر رکھا ہے۔ نہ کہیں
آنے دیتا ہے نہ جانے دیتا ہے۔ دل اس
بات سے بہت خفا ہے۔ لیکن بزرگ جو کرتے
ہیں سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس میں انھیں کا
بھلا ہے۔ وہ بہت سعادت مند ہے۔ ماں

باپکا بہت ادب کرتا ہے لیکن اسے حسن اس درد کا درمان بھی تیرے ہاتھ ہے۔ اس گھاؤ کا مرہم بھی تیرے ہی پاس ہے۔ ایک زمانے سے دل کو آبِ حیات کی لگن لگی ہوئی ہے۔ اور اس کی تلاش میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ اگر تو میری مدد کرے اور کوئی معتبر آدمی میرے ساتھ دے تو آبِ حیات ڈھونڈ کر لاؤں۔ پھر دل تیرے ہاتھ آجاتا ہے۔ دونوں کا مقصد پورا ہوتا ہے۔(۸)

(اس کا ذکر مرتبہ ''سب رس'' میں نہیں ہے)

10- حسن نے اپنے غلام خیال کو نظر کے ساتھ کیا اور ایک یاقوت کی انگوٹھی ان کو دی جس سے آبِ حیات کے چشمے پر مہر کی جاتی تھی۔ خیال اور نظر شہر بدن میں پہنچ کر دل سے ملتے ہیں دل کو جب یہ حال معلوم ہوتا ہے۔ اور خیال حسن کی تصویر کھینچ کر دل کو دکھاتا ہے۔ تو دل ہزار جان سے حسن پر عاشق ہو جاتا ہے۔ کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ آخر نظر کے مشورے سے شہر دیدار کے سفر کا قصد کرتا ہے۔

حسن کے پاس ایک غلام تھا جو پل بھر میں مشرق سے مغرب تک ہو آئے اور آسمان، زمین، عرش کرسی کی خبر لے اائے۔ تیزی میں ہوا اس کے سامنے گرد اور عقل وفراست میں اس کا نظیر نہ تھا۔ نام اس کا خیال تھا۔ حسن کے پاس یاقوت کی ایک انگوٹھی تھی جس سے آبِ حیات کے چشمہ پر مہر کی جاتی تھی۔ وہ اس نے خیال اور نظر کے حوالے کی اور کہا کہ یہ مہر نشانی لے کر جاؤ۔ دل کو دکھاؤ اور اسے جس طرح ہو سکے میرے پاس لاؤ۔(۸)

10- دل کے باپ بادشاہ عقل کا وزیر وہم نامی اپنے آقا کا بڑا خیر خواہ تھا۔ اسے جب یہ خبر ہوئی تو اس نے فوراً بادشاہ سے ساری باتیں جا لگائیں اور کہا کہ نظر جو شہر سے غائب تھا ایک خانہ خراب خیال کو ساتھ لایا ہے اور دونوں شہزادہ دل کو شہر دیدار کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ یہ ضرور کوئی فتنہ پیدا کریں گے اور ملک میں خلل ڈالیں گے۔ ابھی بادشاہ عشق سے صلح ہوئی ہے۔ باہم قول و قرار ہوئے ہیں۔ اگر لڑائی ہوئی تو بہت بڑا ہوگا۔ عشق بہت قوی ہے اس عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ عقل اس خبر کے سننے سے سخت پریشان ہوا اور وہم کے مشورے کے موافق دل اور نظر کو قید کر دیا اور پہرے بٹھا دیئے۔

(اس کا ذکر مضمون میں نہیں ہے)

11- اب نظر اور غمزہ چیدہ اور تجربہ کار آدمیوں کو ساتھ لے کر شہر بدن کی طرف سدھارے۔ کہتے ہیں کہ نظر جس وقت عقل کے بند سے نکل بھاگا تو عقل کو اُسی وقت کھٹکا ہوا تھا کہ یہ جا کر کچھ نہ کچھ فساد برپا کرے گا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی سے سرحد کے سرداروں کے نام احکام جاری کر دیئے تھے کہ نظر قید سے بھاگ گیا ہے۔ اُسے ملک سے باہر نہ جانے دیں اور جہاں ملے قید کر لیں۔ زرق کا بیٹا توبہ جو اپنے کوہستان زہد میں رہتا تھا اُسے بھی عقل نے تاکیدی احکام بھیجے تھے۔ جب نظر اور غمزہ چلتے چلتے وہاں پہنچے تو قلعہ کے دیدبان نے اطلاع دی کہ نظر لشکر لئے پہاڑی کے نیچے پڑا ہے۔ تو یہ غصہ میں بھرا ہوا فوراً لشکر لیکر چڑھ آیا۔ یہ دونوں بڑی دلیری اور بے جگری سے لڑے اور توبہ کو مار بھگایا۔ یہاں سے چل کر وہ قلندروں کے بھیس میں شہر عافیت کی طرف چلے اور وہاں کے بادشاہ ناموس سے ملے۔ اس پر کچھ ایسا جادو چلے کہ تخت و تاج چھوڑ کر وہ بھی فقیر ہو گیا۔

غرض نظر اور غمزہ چیدہ اور تجربہ کار آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر شہر تن کی طرف سدھارے اور سو منزل کی ایک منزل کر کے بھاگا بھاگ وہاں پہنچے۔ کہتے ہیں کہ نظر جس وقت عقل کے بند میں نکل بھاگا تھا تو عقل کو اُسی وقت کھٹکا ہوا کہ یہ جا کر کچھ نہ کچھ فتنہ برپا کرے گا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی سے سرحد کے سرداروں کے نام احکام جاری کر دیئے تھے کہ نظر قید سے بھاگ گیا ہے۔ اسے ملک سے باہر نہ جانے دیں۔ زہد ورزق کا ایک پہاڑ تھا وہاں رزق کا بیٹا توبہ رہتا تھا۔ اسے خاص کر اس کام پر متعین کیا تھا کہ نظر کو سرحد سے باہر نہ جانے دے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ غمزہ اور نظر دونوں بے خبر رات کے وقت اسی پہاڑ کے تلے پہنچے۔ اس پہاڑ کے دامن میں ایک پھول باڑی تھی۔ وہاں آرام کیا۔ جگہ بہت سہانی، رات کے جاگے ہوئے تھے، خوب نیند آئی۔ (۱۰)

12- دوسرے روز قامت نے عقل کے لشکر پر قیامت برپا کردی۔ تیسرے دن رات کو زلف نے شبخوں مارا، سوتے ہوؤں کو پچھاڑا۔ اتنے میں باس (نسیم) پہنچی۔ اس نے دل کو بہت کچھ ڈھارس دی اور پے در پے حملوں سے غنیم کے لشکر میں کھلبلی مچادی کے زلف کو بھگا دیا اور عشق کا لشکر تتر بتر ہوگیا۔

دوسرے روز قامت نے عقل کے لشکر میں قیامت برپا کردی۔ تیسرے دن رات کو زلف نے شبخوں مارا، سوتے ہوؤں کو پچھاڑا اور سارے لشکر میں کھلبلی مچادی۔ اتنے میں باس آئی۔ دل میں اور اس میں بہت محبت تھی۔ اس نے دل سے کہا ڈرو نہیں میں تمہاری مدد پر ہوں۔ لیکن کام بہت کٹھن ہے۔ بھاگنا نامردی ہے۔ اب سوائے مرنے مارنے کے کوئی چارہ نہیں۔ مردی کا یہی وقت ہے۔ دل نے کہا۔ مجھے تجھ سے بہت توقع ہے۔ میں بھی دل ہوں لڑنے مرنے میں ثابت قدم ہوں۔ مگر حسن و عشق کا لشکر بہت قوی ہے۔ چیونٹیوں کی ہاتھی سے لڑائی ہے۔ لیکن رن چھوڑنا عاشقوں کو زیبا نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے دو چار خوب زور کے حملے کئے۔ عشق کے لشکر کو تہ و بالا کردیا۔ چوتھے دن بھی یہی آفت برپا رہی۔ دونوں لشکر برابر اڑے رہے۔ نہ کسی کی جیت ہوئی نہ کسی کی ہار۔

12- عقل نے جو یہ دیکھا تو حواس جاتے رہے۔ سارا لشکر تو کہیں، میں کہیں، فرار ہوگیا۔ عقل بیچارہ مارا مارا پھرا کہیں ٹھکانا نہ ملا۔

عقل نے جب دل کو گھوڑے پر سے گرا دیکھا تو حواس جاتے رہے۔ سینہ شق ہوگیا۔ عقل کا لشکر یہ ماجرا دیکھ کر فرار ہوگیا۔ اور کوئی باقی نہ رہا۔ عقل بیچارا مارا مارا پھرا۔ کہیں ٹھکانا نہ ملا۔ کوئی کہتا شہر بدن کو چلا گیا۔ کوئی کہتا مارا گیا، غرض کچھ پتہ نہ چلا۔

13- اپنی دائی ناز کو بلایا اپنی بے قراری اور بے تابی کا حال سنایا۔ دائی نے کہا جلدی اچھی نہیں مصلحت سے کام لینا چاہئے۔ ورنہ اس میں بڑی بدنامی ہوگی۔ مناسب یہ ہے کہ رخسار کے گلزار میں ایک کنواں ہے جسے چاہ ذقن کہتے ہیں، کچے سونے کا بنا ہوا ہے اور اس کا سواد بھی اچھا ہے۔ فی الحال دل کو وہاں بند رکھا جائے۔ دل بیچارہ یہاں گرفتار ،ادھر حسن بے قرار۔

اپنی دائی کو بلایا جو آفت کا پرکالا تھی۔ اس کا نام ناز تھا۔ اُسے اپنی درد بھری داستان سنائی۔ اور صلاح پوچھی کیا کروں۔ ایسا نہ ہو کہ خلق میں رسوائی ہو۔ میری رائے میں یہ آتا ہے کہ مہر سپہ سالار کو عشق کے حضور میں بھیجوں اور اس کے ذریعہ سے عقل کے قرار اور اپنی فتح کی خبر سناؤں۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔ ناز دائی نے اس تدبیر اور عقل کی بہت تعریف کی۔ غرض مہر نے جا کر فتح کی خبر سنائی۔ عشق یہ سن کر عقل پر بہت ہنسا اور کہا کہ یہ بڑا نالائق ہے کہ ایسے جھگڑوں میں پڑتا ہے۔ یہ عقل دیوانہ ہے جو عشق سے بھڑنا چاہتا ہے۔ اسے عشق اور حسن کے کاموں میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی؟ آخر بھاگنا پڑا نہ۔ اب زلف سے کہو کہ دل کے گلے میں حلقے کا طوق ڈالے اور تاروں کی زنجیروں سے جکڑ کر رکھے۔ عقل بہت فتنہ پرداز ہے۔ ناز، غمزے، شیوے، عشوے سے کہنا کہ ذرا ہشیار رہیں۔ (۱۴۔۱۳)

(اس کا ذکر مرتبہ ''سب رس'' میں نہیں ہے)۔

ناز دائی نے یہ ساری کیفیت حسن کو آ سنائی اور کہا کہ اس معاملے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ جلدی سے کام خراب ہوتا ہے۔

اب اس عاشق (دل) کو کسی حکمت سے
دوسری جگہ رکھیں۔ اور ملنے کی تدبیر کریں۔
جلدی میں رسوائی کا ڈر ہے۔ مناسب یہ ہوگا
کہ رخسار کے گلزار میں ایک کنواں ہے جو کچے
سونے سے تیار کیا گیا ہے اور اس کا سواد بھی
بہت سہانا ہے۔ فی الحال اس میں بند رکھا
جائے۔ عشق کے راز کو فاش کرنا مصلحت
نہیں۔ دل بیچارا یہاں گرفتار تھا اور اس اُمید
میں تھا کہ شاید میرا عشق زور زور کرے اور
حسن کو میرے حال پر رحم آئے۔ ادھر حسن
بے قرار تھی اور فراق یار نے انگاروں پر لٹا رکھا
تھا، کھانا، پینا، سونا حرام ہو گیا تھا۔ (۱۴)

14- اس نے کہا انشاء اللہ اگر میری عقل
میرے ساتھ ہے تو اسے یہاں لا کر پہنچا دوں
گی۔ اول مجھے یہ بتا وہ ہے کہاں؟ پھر اس نے
مل کر اس کے دل کا بھید پاؤں گی اور جہاں تو
کہے گی وہاں لاؤں گی۔ حسن نے زلف کو حکم
دیا کہ دل کے پیچ سب دل کھول دے اور
اسے چاہ ذقن سے باہر نکال اور اس کے پاؤں
کی گرد اپنے بالوں سے جھاڑ اور دلکشا باغ میں
لا کر پہنچا۔ (۱۴)

(اس کا ذکر مرتبہ ''سب رس'' میں نہیں ہے)۔

14- غیر نے اِدھر تو حسن اور دل سے یہ فریب کیا، اُدھر اپنے باپ رقیب سے جگا لگائی اور حسن اور دل کے کرتوتوں کی ساری کیفیت سنائی۔ وہ سنکر بہت برا فروختہ ہوا، شہر دیدار میں آیا اور دل کو بندی خانے سے ہوا، شہر دیدار میں آیا اور دل کو بندے خانے سے نکال شہر سگسار میں لے گیا۔ وہاں ہجر نام کا ایک کوٹ تھا، اسی میں قید کر دیا۔ دل بیچارہ سخت پریشان اور جینے سے بیزار تھا۔ تمام حالات سے بے خبر جی ہی جی میں یہ کہتا تھا کہ مجھ سے ایسی کون سی خطا ہوئی کہ حسن نے یہ ستم مجھ پر ڈھایا ہے۔

غیر نے ادھر تو حسن اور دل سے یہ فریب کیا اور ادھر اپنے باپ رقیب سے جا لگائی۔ وہ یہ ماجرا سن کر بہت برافروختہ ہوا اور شہر دیدار میں آیا اور دل کی تلاش شروع کی۔ آخرا سے حسن کے بندی خانے میں پایا۔ جادو اور ٹونے میں کمال رکھتا تھا۔ خیال اور نظر اور تبسم پر کچھ دانے پڑھ کر پھینکے۔ یہ تینوں دیوانے ہو گئے۔ اور دل کو بندی خانے سے نکال کر شہر سبکسار کو لے گیا۔ وہاں ایک کوٹ ہجر نام کا تھا۔ اس میں قید کر دیا۔ یہاں بیچارہ دل اتنا پریشان ہوا کہ جینے سے بیزار ہو گیا اور اپنے کئے پر بہت پچتایا اور اپنے حال پر بہت تاسف کیا۔ تمام حالات سے بے خبر جی ہی جی میں کہتا تھا کہ مجھ سے کون ایسا قصور ہوا تھا کہ حسن نے یہ ستم مجھ پر ڈھایا۔ آخر مجھ سے پوچھنا تو تھا کہ میں نے کیا خطا کی۔ یہ کیا انصاف ہے کہ دوسرے کے کہنے سننے سے مجھے زندہ درگور کر دیا۔ میں نے بُرا کیا جو اسی جگہ دل لگایا۔ عورت بھی عجیب بلا ہے۔ خدا اس سے پناہ میں رکھے۔ غرض ان باتوں پر غور کرنا اور دل ہی دل میں کڑھنا۔(۱۶)

حوالے

1- ’’حیات وجہی‘‘۔ڈاکٹرم۔ق۔سعید۔ص27۔1990ء

2- ایضاً ص64

3- اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست’’نصیرالدین ہاشمی‘‘1957ء

4- ایضاً

5- کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات (جلداول) نصیرالدین ہاشمی۔1961ء

6- ایضاً

7- ’’مخطوطات انجمن ترقی اُردو‘‘ (جلد دوم) مرتب افسر صدیقی امروہوی۔ص 260-257 ۔ 1967ء

8- ایضاً ص262-261

9- تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو (جلدسوم)۔سیدمحی الدین قادری زوؔر،ص70۔1957ء

10- ایضاً ص324

11- تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو (جلد چہارم) ۔ سیدمحی الدین قادری زوؔر۔ص 273 ، 1957ء

12- مضمون اُردو نثر کی ایک قدیم’’مولوی عبدالحق‘‘ رسالہ اُردو، شمارہ چہارم۔ص1، 1924ء

13- ’’مضمون اُردو نثر کی ایک قدیم‘‘ مولوی عبدالحق، رسالہ اُردو شمارہ۔ چہارم۔ص1۔1924ء

14- ایضاً ص2-1

15- ’’سب رس‘‘ ملاوجہی۔مرتب مولوی عبدالحق ص275، 1935ء

16- مضمون اُردو نثر کی ایک قدیمن۔مولوی عبدالحق، رسالہ اُردو، شمارہ چہارم ص2، 1924ء

17- ’’سب رس‘‘ ملاوجہی۔مرتب مولوی عبدالحق ص5، 1935ء

18- اُردو شہ پارے (جلداول) سیدمحی الدین قادری زورص86۔1929ء

19- ''سب رس'' ملاوجہی مرتب مولوی عبدالحق ص52، 1935ء

20- مضمون اُردو نثر کی ایک قدیم کتاب۔ مولوی عبدالحق، رسالہ اُردو، شمارہ چہارم، ص1، 1924ء

21- مخطوطات انجمن ترقی اُردو پاکستان (لدسوم) مرتب افسر صدیقی امروہوی۔ ص۔58-257۔ 1967ء

22- ایضاً ص62-216

23- ''سب رس کی تنقید وتدوین''۔ حمیرہ جلیلی ص4۔1983ء

24- ایضاً ص4

25- ''سب رس'' ملاوجہی۔ مرتب مولوی عبدالحق3-2، 1924ء

26- ''اُردوشہ پارے'' (جلداول) سیدمحی الدین قادری زور ص100۔1929ء

27- ''سب رس'' ملاوجہی۔ مرتب مولوی عبدالحق ص6۔1924ء

28- ایضاً ص10

29- مضمون ''سب رس کے ماخذ اور مماثلات ایک تنقیدی جائزہ''۔ عزیز احمد۔ رسالہ ''سب رس'' ص 67، 2011ء

30- ''سب رس کی تنقیدی تدوین''۔ حمیرہ جلیلی ص64۔1983ء

31- ''اُردو کی نثری داستانیں''۔ گیان چندجین ص115، 1987

32- ''سب رس'' ملاوجہی۔ مرتب مولوی عبدالحق ص9، 1935ء

33- ایضاً ص11

34- ایضاً ص13-12

35- ''سب رس کا تنقیدی جائزہ''۔ منظراعظمی ص35-32، 1986ء

36- ''سب رس'' ملاوجہی۔ مرتب مولوی عبدالحق ص7، 1935ء

37- ایضاً ص8

38- سب رس کی تنقیدی تدوین حمیرہ جلیلی۔ ص86۔1983ء

حاصل مطالعہ

مولوی عبدالحق کے دکنی متون کا تحقیقی وتقابلی مطالعہ دراصل عبدالحق کے اہم کتابوں کا مطالعہ ہے۔انھوں نے جب انجمن ترقی اردو کے معتمد کا عہدہ سنبھالا تو تصنیف وتالیف اور اشاعت کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے غالب شناسی کے موضوع پر مشتمل کتاب شاءکرنا چاہتے تھے چنانچہ 1914ء میں اس ارادہ کو انہوں نے اخبار میں اشتہار اور نجی خطوط کے ذریعہ اردو دنیا پر واضح کیا۔اپنے خطوط کے ذریعہ انہوں نے اقبال، سلیم پانی پتی اور نظم طباطبائی کو بھی غالب پر مضامین لکھنے کی دعوت دی تھی۔عبدالحق کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا لیکن اسی دعوت کے نتیجہ میں عبدالرحمٰن بجنوری نے محاسن کلام غالب لکھی۔

مولوی عبدالحق نے 1921ء میں انجمن کا ترجمان رسالہ ''اردو'' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔اردو کے پہلے پرچے میں انہوں نے محاسن کلام غالب کا نصف حصہ شائع کیا۔ اسی رسالے میں عبدالحق نے پہلی مرتبہ گولکنڈہ کے پانچویں بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے قلمی کلیات کا تعارف پر مبنی مضمون لکھا تھا۔ یہ مولوی عبدالحق کی دکنیات سے متعلق پہلی تحریر ہے۔اسی تحریر کے بعد انہیں دکنی ادب کی اہمیت کا احساس واندازہ ہوا۔ قلی قطب شاہ کے کلام کی بازیافت نے اردو ادب کی تاریخ کو دوسو برس قدیم بنا دیا تھا۔ چنانچہ 1921ء سے 1934ء تک عبدالحق نے دکنی ادب پر توجہ دی اور کئی نایاب متون مرتب وشائع کئے۔

مقالے کی ابتداء میں مولوی عبدالحق کی سوانح اور ان کی علمی وادبی خدمات بیان کرنے کے بعد راقمۃ الحروف نے مولی عبدالحق کے مرتبہ دکنی مثنویوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔مولوی عبدالحق نے دکنی کی تین مثنویوں، قطب مشتری، گلشن عشق اور جنگ نامہ عالم علی خاں کو مرتب وشائع کیا ہے۔ان تین مثنویوں میں دو مثنویاں قطب مشتری اور گلشن عشق بزمیہ حیثیت رکھتی ہیں اور جنگ نامہ عالم علی خان رزمیہ مثنوی ہے۔

مولوی عبدالحق نے قطب مشتری کا متن دو نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں محفوظ تھا اور دوسرا نسخہ عبدالحق نے لندن سے حاصل کیا تھا۔قطب مشتری کے مقدمہ میں مولوی صاحب نے لندن کے نسخہ میں موجود متن پر روشنی ڈالی۔ میں نے مولوی عبدالحق کی مرتبہ قطب مشتری کے تقابلی مطالعہ کی غرض سے لندن کے نسخہ کی Digital Copy حاصل کی اور پھر تقابلی مطالعہ مقالے میں پیش کیا۔اس

مطالعہ کے نتائج کو میں نے تفصیل سے مقالے میں درج کیا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ غالباً مولوی عبدالحق نے لندن کا نسخہ نہیں دیکھا تھا۔

گلشن عشق کو مولوی عبدالحق نے چار قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے لیکن کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ایک قدیم ترین قلمی نسخہ انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ادارہ ادبیات اردو کے نسخہ کو حاصل کرنے کے بعد تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں کو مولوی عبدالحق نے تین نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ مثنوی کو مرتب کرتے ہوئے انہوں نے صرف چار صفحات کا مختصر مقدمہ لکھا ہے۔ راقمۃ الحروف کو ادارہ ادبیات اردو اور کتب خانہ آصفیہ میں اس مثنوی کے قلمی نسخے دیکھنے کا موقع ملا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ میں دکن کی سیاست اور تاریخ میں اس جنگ کی اہمیت پر صرف چار سطروں میں ذکر کیا ہے اور مثنوی کا خلاصہ بھی نہیں لکھا۔ مثنوی کا ایک اہم کردار عالم علی خاں کی ماں کا ہے جو اپنے اکلوتے نوجوان بیٹے (عمر 20 برس) کے انجام سے فکر مند نظر آتی ہے اور بیٹے کی شہادت پر بین کرتی ہے شاعر نے ماں کے بین کو بڑے پر اثر انداز میں قلمبند کیا ہے۔ اردو مثنویوں میں ایسا بیان صرف مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق میں ملتا ہے۔ میں نے مقالے میں مثنوی کا خلاصہ لکھنے کے علاوہ ماں کے کردار پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور مولوی عبدالحق کے مرتبہ متن کا تقابل ادارہ ادبیات اردو کے قلمی نسخہ سے کیا ہے۔

مقالے کے تیسرے باب میں مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی تذکروں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ عبدالحق نے اسد علی خاں تمنا کا تذکرہ گل عجائب اور لچھمی نرائن شفیق کا تذکرہ چمنستان شعرا کو مرتب و شائع کیا ہے۔ میں نے ان دونوں تذکروں کا تقابلی مطالعہ کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں موجود قلمی نسخوں کی Digital Copies حاصل کرتے ہوئے کیا ہے اور حاصل مطالعہ مقالے میں درج کیا ہے۔

مولوی عبدالحق نے دکنی نثر کی دو تصانیف کو مرتب و شائع کیا ہے۔ معراج العاشقین اور سب رس۔ معراج العاشقین کو مولوی عبدالحق نے دو نسخوں کی مدد سے مرتب کیا اور اس کتاب کو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف قرار دیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اس تصنیف کو اردو نثر کا پہلا نمونہ خیال کیا۔ عبدالحق نے یہ کتاب 1924ء میں مرتب کی۔

مولوی عبدالحق کو یہ تسامح اس لیے ہوا کہ متن میں مخدوم حسینی شہباز کے الفاظ ملتے ہیں۔ مخدوم حسینی، حضرت بندہ نواز کی عرفیت ہے اور شہباز وتخلص استعمال کیا کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے متن میں بیان کردہ موضوع اور فلسفہ پر توجہ نہیں کی۔ 1967ء میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب 'معراج العاشقین کا مصنف'' میں اس متن کا مطالعہ بہ اعتبار موضوع کیا اور اس میں بیان کئے گئے فلسفہ کی بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ یہ کتاب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی نہیں بلکہ دوسو برس بعد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کی تصنیف ہے اور معراج العاشقین دراصل ان کی فارسی رسالے تلاوتِ وجود کا اردو میں آزاد ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے یہ بھی واضح کیا کہ اس میں جو فلسفہ بیان ہوا ہے اسے حضرت بندہ نواز کے ایک سو پچاس سال بعد حضرت امین الدین علی اعلی نے اختراع کیا تھا اور اس فلسفہ کو انہوں نے پانچ عناصر پچیس گن کے نام سے یاد کیا ہے۔ میں نے اس تمام اجمال کو تفصیل کے ساتھ مقالے میں بیان کیا ہے۔

ملا وجہی کی سب رس کو مولوی عبدالحق نے 1932ء میں چار قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا۔ اس کا تعارف انہوں نے 1923ء میں رسالے اردو میں مضمون ''اردو کی ایک قدیم کتاب'' کے عنوان سے کروایا تھا۔

سب رس کے مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ انہوں ن ے چار نسخوں کی مدد سے یہ متن مرتب کیا ہے لیکن انہوں نے صرف دو نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔ مولوی عبدالحق نے سب رس کے ماخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وجہی نے این سیبک فتاحی کی تین فارسی کتابوں سے یہ قصہ اخذ کیا ہے لیکن سب رس کی تمہید میں کہیں اس کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب رس ایک تمثیل ہے اور وجہی نے تمثیلی انداز ہی میں اپنے ماخذ کی نشاندہی کی ہے جس کی نشاندہی میں نے مقالے میں کی ہے۔

مولوی عبدالحق کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے مخطوطات کے بوسیدہ ذخیرہ کی بازیافت کی اور ان متون کو شائع کرتے ہوئے محفوظ کردیا اور اردو کی تاریخ کو دوسو برس قدیم قرار دیا۔ یہی ان کا کارنامہ ہے۔

کتابیات

بنیادی کتب

1۔	عبدالحق مولوی	مرتب قطب مشتری	1939ء
2۔	عبدالحق مولوی	مرتب گلشن عشق	1952ء
3۔	عبدالحق مولوی	مرتب جنگ نامہ عالم علی خاں	1932ء
4۔	عبدالحق مولوی	مرتب گل عجائب	1936ء
5۔	عبدالحق مولوی	مرتب چمنستان شعراء	1928ء
6۔	عبدالحق مولوی	مرتب معراج العاشقین	1924ء
7۔	عبدالحق مولوی	مرتب سب رس	1935ء
8۔	عبدالحق مولوی	''مقدماتِ عبدالحق'' مرتبہ عبادت بریلوی۔طبع اول	
9۔	عبدالحق مولوی	''چند ہم عصر''	1986ء
10۔	عبدالحق مولوی	''نصرتی''	1962ء

معاون کتب

1۔	افسر صدیقی امروہوی	مخطوطات انجمن ترقی اردو، پاکستان، جلد دوم	1984ء
2۔	افسر صدیقی امروہوی	مخطوطات انجمن ترقی اردو، پاکستان، جلد سوم	1984ء
3۔	افسر صدیقی امروہوی	مخطوطات انجمن ترقی اردو، پاکستان، جلد چہارم	1984ء
4۔	افسر صدیقی امروہوی	مخطوطات انجمن ترقی اردو، پاکستان، جلد پنجم	1984ء
5۔	اکبرالدین صدیقی	''بجھتے چراغ''	1972ء
6۔	انورالدین محمد ڈاکٹر	مرتب ''اردو کی ادبی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ''	2011ء

7۔	تمنا اسد علی خاں	''تذکر گل عجائب'' مخطوطہ مخدونہ کتب خانہ آصفیہ نمبر جدید1448	
8۔	تمنا اسد علی خاں	''تذکر گل عجائب'' مخطوطہ مخدونہ کتب خانہ سالار جنگ نمبر144	
9۔	حسینی شاہد	''سید شاہ امین الدین علی اعلی حیات اور کارنامے''	1973ء
10۔	حضرت خواجہ بندہ نواز	''معراج العاشقین'' مرتب عبدالحق	1924ء
	حفیظ قتیل	''معراج العاشقین کا مصنف''	1967ء
	حفیظ قتیل	''میراں جی خدانما''	1961ء
	حمید اورنگ آبادی	''تذکرہ گلشن گفتار'' مرتب ایم کے فاطمی	1963ء
	حمیدہ جلیلی	''سب رس کی تنقید و تدوین''	1983ء
	جمیل جالبی ڈاکٹر	''ادبی تحقیق''	2004ء
	جمیل جالبی ڈاکٹر	''تاریخ ادب اردو'' جلد اول	1977ء
	خلیق انجم	''معراج العاشقین''	1957ء
	رفیعہ سلطانہ ڈاکٹر	''اردو نثر کا آغاز وارتقاء	1978ء
	زور سید محی الدین	''اردو شہ پارے''	1929ء
	زور سید محی الدین	''تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو'' جلد اول	1984ء
	زور سید محی الدین	''تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو'' جلد سوم	1984ء
	زور سید محی الدین	''تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو'' جلد پنجم	1984ء
	شمس اللہ قادری	''اردوئے قدیم''	1928ء
	شاہ عطاالرحمٰن عطا کاکوی	''تلخیص تذکرہ چمنستان شعراء''	1968ء
	عبدالجبار خاں ملکاپوری	''محبوب الزمن تذکرہ شعراء دکن''	1911ء
	عقیل رضوی سید محمد	''شمالی ہند میں اردو مثنوی''	1970ء

غضنفر حسین غضنفر	''مخطوطہ مثنوی عالم علی خاں'' مخزونہ ادارہ ادبیات اردو	
غضنفر حسین غضنفر	''مخطوطہ مثنوی عالم علی خاں'' مخزونہ کتب خانہ آصفیہ	
فتوت	''تذکرہ ریاض حسنی''	1186ھ
فرمان فتح پوری	''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''	1984ء
گوپی چند نارنگ	''معراج العاشقین''	1957ء
گوپی چند نارنگ	''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں''	2001ء
گیان چند جین	''تجزیے''	1973ء
گیان چند جین	''اردو مثنوی شمالی ہند میں''	1965ء
گیان چند جین	''اردو نثری داستانیں''	1987ء
گیان چند جین سیدہ جعفر	''تاریخ ادب اردو'' جلد اول	1998ء
گیان چند جین سیدہ جعفر	''تاریخ ادب اردو'' جلد سوم	1998ء
لطف النساء امتیاز	''کلیات امتیاز'' مرتب احمد علی شکیل ڈاکٹر	2005ء
لچھمی نرائن شفیق	''تذکرہ شام غریباں'' مرتب محمد اکبرالدین صدیقی	1977ء
لچھمی نرائن شفیق	مثنوی تصویر جاناں'' مرتب خواجہ حمیدالدین شاہد	1957ء
م۔ن سعید	''حیات وجہی''	1990ء
محمد رضا ساجد رضوی سید	''لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے''	1990ء
مختار الدین احمد	''ہندوستانی ادب کے معمار عبدالحق''	1984ء
مسرت فردوسی ڈاکٹر	''بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمات قیام اورنگ آباد کے دوران''	1999ء
منظر اعظمی	''سب رس کا تنقیدی جائزہ''	1986ء
مہر جہاں	''میر اسد علی خاں تمنا حیات اور کارنامے''	1984ء
نثار احمد فاروقی	''تلاش میر''	1994ء

نثیر احمد فاروقی	''تین تذکرے''	1968ء
نصرتی	''گلشن عشق'' مرتب سید محمد	1940ء
نصیرالدین ہاشمی	''کتب خانہ سالار جنگ کے اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست''	1957ء
نصیرالدین ہاشمی	''کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات'' جلد اول	1961ء
نصیرالدین ہاشمی	''یوروپ میں اردو مخطوطات''	1932ء
نصیرالدین ہاشمی	''دکن میں اردو''	2002ء
یوسف تقی	''محیص و تجزید''	2010ء

رسالے

1۔	اردو	شمار چہارم	1924ء
2۔	اردو	جنوری تا مارچ	1986ء
3۔	سب رس	جنوری	1940ء
4۔	سب رس	جون	2011ء
5۔	سب رس	جولائی	2011ء
6۔	سب رس	فبروری	2015ء
7۔	نوائے ادب	اکتوبر تا دسمبر	2008ء
8۔	نوائے ادب	اپریل تا ستمبر	2009ء

SAMDANI EDUCATIONAL SOCIETY, HYDERABAD

URDU WING

ایک روزہ قومی سمینار

ONE DAY NATIONAL SEMINAR

ON

"ISMAT CHUGTAI FIKR O FUN" **"عصمت چغتائی فکر و فن"**

Sponsered by

National Council for Promotion of Urdu Language

M/o H.R.D, Department of Higher Education, Government of India, New Delhi

CERTIFICATE

This is to Certify that ANJUM FATIMA. انجم فاطمہ۔ *Participated/Presented*

a paper entitled عصمت چغتائی کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ۔ */ Presided over*

a technical session in National Seminar held on 26 March 2016..

(Dr. Laeeq Ahmed Siddiqi)
Chief Coordinator Seminar

(Khaleel Ahmed Nadvi Nizami)
President Samdani Educational Society

(Dr. Mohd. Jafer Jari)
Director Seminar

DEPARTMENT OF URDU

UNIVERSITY OF HYDERABAD

INTERNATIONAL SEMINAR

400 YEARS CELEBRATION OF MOHD. QULI QUTUB SHAH

(Literature, Art and culture in Qutub Shahi Dynasty)

In collaboration with A P Urdu Academy & Karnataka Urdu Academy

Certificate

This is to certify that Anjum Fatima *participated/presented a paper entitled* قطب مشتری مرتبہ عبدالحق اور نسخہ لندن کا تقابلی مطالعہ */presided over a technical session in International Seminar held from 19th to 22nd August 2013.*

(Dr. Habeeb Nisar)
Director Seminar

(Prof. K. Muzaffer A
Head, Dept. of Ur

انجم فاطمہ
ریسرچ اسکالر، یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' ایک اہم تصنیف ہے۔ ''چند ہم عصر'' اٹھارہ خاکوں پر مشتمل ہے جو 1900ء سے 1937ء کے درمیان لکھے گئے۔ یہ سب خاکے ایسی شخصیتوں پر ہیں جن کو مولوی عبدالحق خوب اچھی طرح جانتے اور ان سے واقف تھے۔ ان میں سرسید، حالی، مولانا محمد علی جوہر، امیر مینائی، محسن الملک اور وحیدالدین سلیم جیسے اہم قلمکاروں کے علاوہ نام دیو مالی اور نور خاں جیسے غریب اور گمنام لوگ بھی شامل ہیں۔ نور خاں کا خاکہ ''گدڑی کا لال''، ''نور خاں'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ خاکہ کچھ اس طرح سے شروع ہوتا ہے۔

''لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں، نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں۔ اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق رموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔''

اپنے دوسرے خاکہ نام دیو مالی کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔''

اور آگے لکھتے ہیں:

''ایک دن نامعلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ خضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا، اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخری اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔''

مولوی عبدالحق کے خاکوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے خاکوں کو پڑھنے سے قاری کے ذہن میں اس کی تصویر صاف طور پر بن جاتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کو چند الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیئر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ

قرینہ

ہم کلامی	:	پروفیسر ایس اے شکور	6
مضامین:			
اردو سفر نامہ	:	ڈاکٹر معید جاوید	7
دکنی ادب میں حکایت کی روایت	:	ڈاکٹر حمیرہ سعید	11
''شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر رواداری کے آئینہ میں''	:	حلیم بابر	14
حضرت انوار منفرد لب ولہجہ کے نعت گو شاعر	:	سید محبوب قادری نظامی	17
راجا نرسنگھ راج عالی بحیثیت رباعی گو شاعر	:	ایس. ٹی. نوراللہ	22
مولانا محمد علی جوہر بے باک صحافی، عظیم مجاہد آزادی	:	شفیق اطہر جرنلسٹ	25
مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری	:	انجم فاطمہ	27
گوشہ خواتین:			
اردو ترجمہ قرآن کی پہلی مترجم خاتون ''محمود النساء بیگم''	:	ہاشمی سید وہاج الدین	31
ہندوستانی سماج میں لڑکی کا مقام و مرتبہ	:	سیدہ سارہ سلطانہ	35
معاشرت:			
ویلن ٹائن ڈے	:	ڈاکٹر جاں نثار معین	39
گوشہ طلبا:			
طلباء کی نشو و نما میں استاد کا کردار	:	محمد ابراہیم خلیل سہیلی	48
غالب بچوں کی محفل میں	:	حشمت کمال پاشا	51
انشائیہ:			
دعوت نامہ کا ایک انداز یوں بھی	:	اقبال مجیداللہ	55
افسانے:			
ماں کا دل	:	عابدہ محبوب	60
مسیحا	:	طٰہٰ آفندی	64
دل نے جسے چاہا	:	سعادت احمد	67
لخت جگر کی خاطر	:	ثریا جبین	74
کہانی مل گئی	:	استوتی اگروال	77
حصہ نظم:			
غزلیں	:	صلاح الدین نیر	79
غزلیں	:	ڈاکٹر سلیم عابدی	80
غزلیں	:	ڈاکٹر رؤف خیر	81
غزلیں	:	جہانگیر قیاس	82

oOo

UNIVERSITY OF HYDERABAD
DEPARTMENT OF URDU, SCHOOL OF HUMANITIES

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled "MOULVI ABDUL HAQ KE DECCANI MUTOON KA TAHQEEQI WA TAKABALI MUTALIA" submitted by ANJUM FATIMA bearing Reg. No. 09HUPH09 in partial fulfillment of the requirements for the award of Doctor of Philosophy in URDU in the School of Humanities is a bonafide work carried out by her under my supervision and guidance.

This thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for award of any degree or diploma. Part of this thesis has been.

A. Published in the following publications.

1. "Moulvi Abdul Haq ki Khaka Nigari" publish in mahnama "Qaumi Zaban" Hyderabad (ISSN 2321-4627) in February 2019.

B. Presented in the following Conferences.

1. Presented a paper titled "Qutub Mustari Muratiba Abdul Haq aur Nuskha e London ka Qutub Shah" conducted by Department of Urdu, University of Hyderabad on 19^{th} to 22^{nd} August 2013.
2. Presented a paper titled "Ismat Chughtai ke Navolo ka Tazziyati Mutalia" in one day national Seminar titled "Ismat Chughtai Fikr o Fun" conducted by Samdani Educational Society, Hyderabad. On 26^{th} March 2016.

Further, the student was exempted from doing course work (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during her M. Phil programme and the M. Phil degree was awarded.

SL.No	Course Code	Title	Credits	Pass/Fail
1	HU600	Research Methodology	4.00	Pass
2	HU601	Practical Criticism	4.00	Pass
3	HU602	Textual Criticism	4.00	Pass
4	HU680	Dissertation	12.00	Pass

Supervisor Head of the Department Dean School of Humanities

DECLARATION

I,ANJUM FATIMA hereby declare that this thesis entitled "MOULVI ABDUL HAQ KE DECCANI MUTOON KA TAHQEEQI WA TAKABALI MUTALIA" submitted by me under the guidance and supervision of PROF. HABEEB NISAR, is bonafide research work with is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodhganga / INFLIBNET.

Date:

HYDERABAD

Signature of the Student

Name: ANJUM FATIMA

Reg. No. 09HUPH09

MOULVI ABDUL HAQ KE DECCANI MUTOON KA TAHQEEQI WA TAKABALI MUTALIA

Ph.D. Thesis

Submitted by

Anjum Fatima

(M.A., M.Phil)

Superviser

Prof. Habeeb Nisar

2020

Department of Urdu

University of Hyderabad.

Hyderabad